کشتی عشق

گفتنی و ناگفتنی

شورش کاشمیری

شورش کاشمیری

گفتنی و ناگفتنی

مطبوعات چٹان

اشاعت اول - - - - ایک ہزار
اشاعت دوم - ایک ہزار، یکم فروری ۱۹۶۳ء
طابع و ناشر - - مطبوعات چٹان لاہور
مطبوعہ اردو پریس و چٹان پرنٹنگ پریس لاہور
قیمت - - - - چار روپے

گفتنی و ناگفتنی

"چراغ لے کے کہاں سامنے ہوا کے چلے"

انیس

مطبوعات
چٹان،
لاہور

مولانا ظفر علی خاںؒ کے نام



شورش کاشمیری

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

گُفتنی

شعر کی تعریف اس کے اجزائے ترکیبی اور محاسن و معائب کے متعلق اتنا لکھا جا چکا ہے کہ میں نہ اس میں کوئی اضافہ کر سکتا ہوں اور نہ اختصاراً بھی اس کا اعادہ مناسب و موزوں سمجھتا ہوں۔ شعر و ادب سے گہری دلبستگی کے باوجود مجھے اس دائرے میں صاحبِ فن کی حیثیت حاصل نہیں اور حقائق پر بالغ نظرانہ بحث صرف اربابِ فن کا حصہ ہے۔ عام نقطۂ نگاہ سے شعر کے دو جزو ہیں: صورت اور معنویت یعنی اسلوبِ بیان اور مضمون۔ مضمون کے حُسن و خوبی کا معیار یہ ہے کہ وہ بلند اور اچھوتا ہو لیکن محض خیال بندی اور فکر آرائی کا کرشمہ نہ ہو بلکہ اسے حقائق سے تعلق ہو۔ مضمون کو حقائق سے جتنا گہرا اور وسیع تعلق ہوگا، اسی تناسب سے اس کی اونچائی کا درجہ متعین کیا جائے گا۔ اسلوبِ بیان سے مقصود یہ ہے کہ مضمون کی پیشکش کے لیے الفاظ کا جو پیراہن تیار کیا جائے، وہ ہر لحاظ سے طبعی، موزوں اور دلکش ہو۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ الفاظ کی ملائمت، ہم آہنگی، ربط و ضبط اور حُسنِ ترتیب کا معاملہ بڑی حد تک ذوق و وجدان پر موقوف ہے اور ذوق و وجدان کی چیزوں کے لیے جامع و مانع قاعدے مرتب نہیں کیے جا سکتے۔ البتہ مثالیں دے کر واضح کیا جا سکتا ہے کہ کوئی لفظ کسی مقام پر کس وجہ سے موزوں ہے یا کس وجہ سے موزوں نہیں۔ مضمون کی معنویت جس قسم کے الفاظ کی مقتضی ہوتی ہے، وہ فراہم نہ کیے جائیں تو مضمون کا حُسن پوری طرح نمایاں نہ ہو سکے گا۔ اگر حسین پیکر کی شانِ زیبائی غیر موزوں لباس میں مجروح ہو جاتی ہے تو یہ بھی حقیقت ہے کہ قامت کے ناساز و بے اندام ہونے کی تلافی حسین لباس سے نہیں ہو سکتی۔ غرض شعر کا حُسن مضمون اور اسلوب دونوں کے حُسن سے ترکیب پاتا ہے اور ان اجزائے ترکیبی میں سے کسی ایک کی کمی شعر کو اس کے مقامِ بلند سے گرا دیتی ہے۔

جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں، مجھے کسی مجموعۂ اشعار کے تعارف و رہنمائی کی خدمت انجام دینے کا منصب حاصل نہیں تاہم عزیزی شورش کے کلام پر یہ چند سطریں لکھنے کے لیے اس وجہ سے مجبور ہو گیا کہ مامور تھا اور یہ عرض کرنا تحصیلِ حاصل ہے کہ مامور معذور ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس ضمن میں مجھ سے بلند پایہ علمی معیاروں کی امید نہ رکھنی چاہیے۔ میرے سامنے وہی عام پیمانہ ہے، جس کا سرسری ذکر اوپر کر چکا ہوں۔

پیشِ نظر مرقع میرے اندازے کے مطابق تقریباً ایک ہزار اشعار پر مشتمل ہے۔ اس کی نظموں کے موضوع بھی عام نہیں خاص ہیں، جو احوال و ظروف کے تقاضوں سے وقتاً فوقتاً سامنے آتے رہے، تاہم اشعار میں اس لحاظ سے عمومیّت و آفاقیت کا رنگ غالب ہے کہ جن احساسات و تاثرات کا اظہار کیا گیا وہ زیادہ سے زیادہ افراد کے قلوب میں موج زن تھے اور جو بھی انھیں سُنے گا، بے تکلّف پکار اٹھے گا:

میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

اسی نقطۂ نگاہ سے میں نے اس مجموعے کو بہ غور دیکھا اور اپنے خیالات واضح کرنے کے لیے تھوڑے سے اشعار چُن لیے جنھیں مختصر سی تمہیدات و تشریحات کے ساتھ پیش کرنا چاہتا ہوں تاکہ مضامین کی بلندی، ندرت اور جدّت کا اندازہ ہو سکے نیز یہ معلوم ہو جائے کہ وہ کن تاثرات کے ماتحت لکھے گئے اور انھیں حقائق زندگی سے کتنا گہرا تعلق ہے۔ پھر جو کچھ کہا گیا، اس کے لیے اسلوب و انداز ایسا اختیار کیا گیا، جس میں زندگی کی حرارت رواں دواں محسوس ہوتی ہے اور یہی حرارت اشعار کو قلب و روح کی حرارت سے ہم آہنگ کر دیتی ہے

اس نغمہ زار میں جن زمزموں کی دلآویزی اور بلند آہنگی سب سے بڑھ کر قلب کو اپنی طرف کھینچتی ہے، وہ ہیں جو شاعر نے اپنے متعلق الاپے ہیں اور جن میں اس کی انفرادیت یا خودی بطورِ خاص درخشاں ہے۔ ممکن ہے بادی النظر میں سمجھا جائے کہ ان زمزموں کی حیثیت وہی ہے، جس نے عرفی کے کلام میں "در مدحِ خود می گوید" کے زیرِ عنوان آرائش پائی۔ معلوم ہے کہ عرفی کو انھیں اشعار کی بنا پر مدّت مدید تک متکبر، خود پسند اور خود پرست قرار دیا جاتا رہا۔ لیکن جب زندگی کا نقطۂ نگاہ بدلا اور ساتھ ہی اخلاقی معیاروں میں تغیّر پیدا ہوا تو

یہی اشعار عرفی کی خودی اور خودداری کی دستاویز بن گئے۔ اقبال نے "اسرارِ خودی" کی طبع اوّل میں عرفی اور حافظ کا موازنہ کرتے ہوئے اس پہلو کو بہ طورِ خاص نمایاں کیا تھا۔ گویا اقبال کی اصطلاح میں عرفی ایسا شاعر تھا جس کی خودی بیدار تھی اور اس کا کلام سوئے ہوئے قافلہ ہائے خودی کے لیے بانگِ درا کا حکم رکھتا تھا۔

یقیناً ادبیات کی صحت مندی، توانائی اور حیات افروزی کا اصل پیمانہ یہی ہے کہ ان کے مطالعے سے دلوں میں جوشِ عمل کے ولولے بیدار ہوں، سینے جذباتِ صحیحہ کے ہیجان و انفجار سے آتشِ فشاں پہاڑ کی حیثیت اختیار کرلیں۔ عزائم میں پختگی، حوصلوں میں بلندی اور ہمتوں میں استواری جلوہ افروز ہو۔ جن ادبیات کے مطالعے سے حوصلے ٹھٹھر کر رہ جائیں، ولولوں میں پژمردگی اور ارادوں میں افسردگی آجائے، انھیں قوموں کے لیے مہلک قرار دینے میں کیسے کلام ہو سکتا ہے؟

شاعر اپنے متعلق اگر ایسی باتیں کہتا ہے جن میں ایک حد تک خودستائی کا شائبہ پایا جائے تو اس سلسلے میں معذرت کا ایک دل پذیر پہلو وہ ہے، جو عرفی نے پیش کیا:

منکر نتواں گشت اگر دم زنم از عشق   ایں نشّہ بہ من گر نبود با دگرے ہست

دوسرا پہلو یہ ہے کہ حقیقی شاعر جو کچھ کہتا ہے، شدّتِ تاثّر سے مجبور ہو کر کہتا ہے اور اہلِ شدّتِ تاثّر کا صحیح اندازہ عام قلوب نہیں کر سکتے۔ پھر وہ جو کچھ کہتا ہے، کیوں سمجھا جائے کہ اس کا مقصود ستائشِ ذات ہے یعنی وہ اپنی تعریف کر رہا ہے؛ کیوں یہ نہ مانا جائے کہ اس کے پیشِ نظر دعوتِ عام ہے اور وہ ہر قلب پر یہی رنگ چڑھا دینا چاہتا ہے؛ یعنی اپنے الاپے ہوئے زمزموں کو ہر فرد کے سازِ وجود کا ترانہ بنا دینے کا خواہاں ہے۔

فرض کیجیے، ہم نوجوانوں کو دعوت دینا چاہتے ہیں کہ مشکلات سے نہ گھبراؤ، راہِ سعی و جہد میں جو تکلیفیں اور مصیبتیں پیش آتی ہیں، انھیں صبر و استقامت سے جھیل لو، اس لیے کہ مصیبتیں جھیلے بغیر بلند

مقاصد کی تکمیل نہیں ہوسکتی، تو کیا اس دعوت کی حد درجہ موثر اور دل آویز صورت یہ نہیں کہ وعظ و نصیحت کے بجائے ایک عملی خاکہ تیار کرکے پیش کر دیا جائے، جس سے خود بخود آشکارا ہو کہ واقعی زندگی نے مشکلات کے سانچے ہی میں ڈھل کر حقیقی زیبائش و آرائش پائی اور وہ اس قابل بنی کہ ہم اُسے باعثِ فخر قرار دیں؟ میں نے شورش کے مندرجہ ذیل اشعار کو اسی نقطۂ نگاہ سے دیکھا اور سمجھا۔ یہ خودستائی نہیں بلکہ دعوتِ عام ہے، جس کے اثر و نفوذ کا اندازہ پیش کرنا مشکل ہے:

دار و رسن کی گود میں پالے ہوئے ہیں ہم — سانچے میں مشکلات کے ڈھالے ہوئے ہیں ہم
وہ دولتِ جنوں کہ زمانے سے اُٹھ گئی — اس دولتِ جنوں کو سنبھالے ہوئے ہیں ہم

کہوں تو گردشِ لیل و نہار رُک جائے — وہ راز جن سے بہت غم اُٹھائے ہیں میں نے
ہزار بار زمانے کے سرد طاقوں پر — چراغ خونِ جگر سے جلائے ہیں میں نے

افق کی سُرخ قبا سے سراغ ملتا ہے — ہمارا خون ستاروں میں جگمگائے گا
ہمارے بعد کہاں یہ وفا کے ہنگامے — کوئی کہاں سے ہمارا جواب لائے گا

اُلجھیں تو کائنات کے سینے میں ہو شگاف — یلغار ہو تو لشکرِ میدان شکار ہیں
اُٹھیں تو مہر و ماہ کے جلوے ہوں ہم رکاب — پھیلیں تو ہر روش پہ گلوں کا نکھار ہیں
ہم ہیں حرم فروش فقیہوں کے نکتہ چیں — ہم ہیں فقیرِ راہ مگر شہریار ہیں

جس قوم کے نوجوانوں کی رگ رگ میں یہ ترانے بس جائیں، اس کے سر سے عظمت و برتری کا تاج چھیننے کی جرأت کون کر سکتا ہے؟

قوموں کی عظمت، عزیمت اور سبقت فی العمل پر موقوف ہے۔ جب عنانِ اختیار نااہل لوگوں کے ہاتھ میں آجائے تو ان کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ عزیمت اور سبقت فی العمل کی طرف سے عوام کی توجہ ہٹا دیں اور ان جوہروں کی قدر و قیمت کا احساس افسردہ کر دیں، اس لیے کہ وہ خود ان جوہروں سے

تہی دامن بجتے ہیں۔ ہر داعیِ حق کا فرض ہے کہ اس احساس کو ہر لحظہ تازہ و شگفتہ رکھے، اس لیے کہ تمام جرأت مندانہ اقدامات اسی احساس کی تازگی کا کرشمہ ہوتے ہیں۔ عزیمت و سبقت کی روح پژمردہ ہو جائے تو قوموں میں ابھرنے، اچھلنے اور آگے بڑھنے کا جذبہ باقی نہیں رہتا۔ شورش نے غالباً انھیں جوہروں کو درخشاں رکھنے کے لیے یہ شعر کہے:

ہم نے اس وقت سیاست میں قدم رکھا تھا　　جب سیاست کا صلہ آہنی زنجیریں تھیں
سرفروشوں کے لیے دار و رسن قائم تھے　　خانزادوں کے لیے مفت کی جاگیریں تھیں
بے گناہوں کا لہو عام تھا بازاروں میں　　خونِ احرار میں ڈوبی ہوئی شمشیریں تھیں
از افق تا بہ افق خوف کا سناٹا تھا،　　رات کی قید میں خورشید کی تنویریں تھیں

جن جوانمردوں نے مشکلات کی فراوانی سے بے پروا ہو کر قوم کی برتری کے لیے جہاد لیا، ان کے اخلاص میں کیسے شبہ ہو سکتا ہے؟ یہ ایک حقیقت کا بھی اظہار ہے، ساتھ ہی نوجوانوں کے لیے دعوت بھی ہے کہ ادائے فرض میں انھیں مشکلات سے بالکل بے پروا رہنا چاہیے۔

وسیع انسانی آبادیوں کے فکر و عمل میں انقلاب پیدا کرنا آسان نہیں۔ اس کے لیے بڑی مردانگی اور جانبازی کی ضرورت ہوتی ہے اور بے دریغ قربانیاں کرنا پڑتی ہیں۔ اہلِ ہمت نے قربانیوں میں کبھی تامل نہیں کیا۔ لیکن جب انقلاب سیلِ رواں کی طرح آتا ہے تو بعض اوقات تن آسان اور سہل انگار لوگ اس کے ثمرات پر قابض ہو جاتے ہیں اور جن مجاہدوں کے ایثار کی بدولت وہ ثمرات حاصل ہوئے انھیں بے سروپا نکتہ چینیوں کا ہدف بنا لیتے ہیں۔ ایسے ہی نکتہ چینوں کے جواب میں شورش اپنے عہد کے بہادر نوجوانوں کی ترجمانی کرتا ہوا کہتا ہے:

ناقدو! وقت کے افکار بدلنے کے لیے　　میں نے مجبور زبانوں کو نوا بخشی ہے
کج کلاہوں کی رعونت کا اڑایا ہے مذاق　　میں نے تاریخ کے چہرے کو ضیا بخشی ہے

آخری شعر کتنا پاکیزہ ہے۔ تاریخ کا چہرہ کج کلاہوں کی رعونت، بے فکری اور بے حسی سے ضیا نہیں پاتا۔ اُس کی ساری رونق و تابناکی بے باک نوجوانوں کی ولولہ انگیز قربانیوں پر موقوف ہے۔ وہ ہمت و جرأت سے آگے بڑھ کر رعونت کو ٹھکراتے ہیں اور قوم میں محبت، اخوت اور مساوات کی روح کو بیدار کرتے ہیں۔ اسی طرح تاریخ کے صفحات پر روشنی کی کرنیں رقص کرنے لگتی ہیں۔ پھر کہتا ہے:

سمجھی افرنگ کو للکار کہی ہے میں نے | اپنے اسلاف کے بے خوف چلن کی خاطر
نوجواں عمر کے دس سال گزارے میں نے | قید کی گود میں ناموسِ وطن کی خاطر
تم کبھی اپنے کیے پر بھی نظر ڈالو گے؟ | تم نے کانٹوں کے عوض سرو و سمن بیچے ہیں
تم نے تاریخ کے سینے میں سناں گاڑی ہے | تم نے بے خوف شہیدوں کے کفن بیچے ہیں
بارہا سختیٔ قانون کا دل ڈوب گیا | میری للکار سے انگریز کے ایوانوں میں
اب میں اک تہمتِ بے جا کے سوا کچھ بھی نہیں | دس برس کاٹ کے پنجاب کے زندانوں میں

تہمت کے معنی ہیں جھوٹا الزام، طوفان، افترا، بہتان۔ اسے زیادہ مؤثر بنانے کے لیے "بے جا" کا اضافہ کیا گیا۔ یہ شاعر کا تاثر ہے اور اس شدّتِ تاثر نے اصل مضمون میں جو حُسن پیدا کیا، وُہ ذوقی و وجدانی ہے۔ پھر یہ صرف ذاتی سرگزشت نہیں بلکہ دعوتِ عام ہے، یعنی شورش اپنی کہانی ایسے انداز میں پیش کر رہا ہے کہ نوجوان اسی روحِ عمل سے معمور ہو جائیں۔

کبھی کبھی ایسے حالات بھی پیش آ جاتے ہیں کہ انقلاب بہ لحاظ نتائج نامکمل رہتا ہے اور عوام اس کے ثمرات و برکات سے پوری طرح مستفید نہیں ہوتے۔ شورش کے مندرجہ ذیل اشعار ایسے ہی احساس کے آئینہ دار ہیں:

بڑی خونخوار ہے سرمایہ و محنت کی آویزش | خداوندانِ سیم و زر کی نادانی نہیں جاتی
اب اپنا ملک ہے بالکل بجا میرے خداوندو! | مگر جمہور کے چہرے کی عریانی نہیں جاتی

تمھاری باندیاں ریشم کے انباروں میں تُلتی ہیں / ہماری بیٹیوں کے تن کی عریانی نہیں جاتی
فقیہوں کی بدولت ایک ایسا وقت آتا ہے / خدا کے نام پر جب بات تک مانی نہیں جاتی

خونِ احرار سے لبریز ہیں جام و مینا / شہ رگِ عدل پہ ہے خنجرِ جلّاد ابھی

باایں ہمہ شورش کو یقین ہے کہ انقلاب کامیابی و مرادمندی کی منزل پر ضرور پہنچے گا۔ امید کا روشن چہرہ اس کے سامنے ہے اور وہ اپنے عہد کو امید ہی کا پیغام دیتا ہوا کہتا ہے:

کچھ دنوں اور اندھیرے کی فراوانی ہے / طلعتِ صبحِ درخشاں کی قسم
کچھ دنوں اور غریبوں پہ ستم رانی ہے / کج کلاہوں کے گریباں کی قسم

ناؤ منجدھار میں بے خوف و خطر کھیلے گی / ناخدا بربطِ طوفاں پہ رجز خواں ہوں گے
راہرو اپنی مسافت کا صلہ مانگیں گے / رہنما اپنی سیاست پہ پشیماں ہوں گے

واضح ہے کہ ان اشعار کے بعض الفاظ و اصطلاحات سے متاثر ہو کر انھیں کمیونزم کی صدائے بازگشت نہ سمجھنا چاہیے یہ اس عادل اور متوازن انسانی نظام کی دعوت ہے جو اسلام اس دنیا میں لے کر آیا اور اسی نظام کے لیے قدرت بقائے دوام کی ضامن ہے۔

مجموعے میں نوجوانوں کو براہِ راست دعوتِ عمل دینے کی مثالیں بکثرت ملتی ہیں میں صرف دو اقتباس پیش کروں گا

حیات کیا ہے عناصر کے تجربے کے سوا / سوادِ ارض کو خلدِ بریں بنا کے چلیں
شہنشہوں کو جھکائیں حضورِ محنت میں / قلم کو تیغ بنا کر فضا پہ چھا کے چلیں

جوانیوں کی نئی ڈالیوں پہ لہرائیں / محبتوں کے نئے کارواں بنا کے چلیں

حفظِ خودی پہ نظمِ جہاں کا مدار ہے / یہ راز آشکار اگر کر سکے تو کر
بیدار کر ضمیر کو، بے باک کر عمل، / یہ عہدِ استوار اگر کر سکے تو کر

حبِ وطن کا یہ ترانہ بھی بڑا ہی دل آویز ہے:

صبا کے روپ میں ہر سمت پھیل جاؤں گا — مرے وطن! تری عظمت کے گیت گاؤں گا
بچھاؤں گا ترے ذروں پہ فرشِ لالہ و گل — ترے افق کے ستاروں میں مسکراؤں گا
تری طلب میں مرے لختِ دل بھی حاضر ہیں — انھیں سے میں ترے دیوار و در سجاؤں گا
اگر تصرفِ گلچیں رہا بہاروں پر — تو پھر میں ان کا لہو تک نچوڑ لاؤں گا
خدا نے شعلہ نوائی مجھے عطا کی ہے — عوام سوئے ہوئے ہیں انھیں جگاؤں گا

حسنِ تخیل کے سلسلے میں "ہلالِ عید" والی نظم کا یہ بند خاص توجہ کا مستحق ہے:

تری نگاہ نے جس کو ہلال سمجھا ہے — کہیں یہ نوحۂ قدرت کا کوئی بند نہ ہو
سوادِ ارض کے انساں کی بربریت پر — مرے ندیم! فرشتوں کا زہر خند نہ ہو

یہ چند چیزیں میں نے سرسری طور پر پیش کر دیں اس سلسلے کا امتداد مناسب معلوم نہیں ہوتا۔ جب خواندگانِ کرام فکر و احساس کے اس بوستانِ بوقلموں کی گلگشت کا قصد فرما چکے ہیں تو کیا ضرور ہے کہ اس کی مختلف روشوں سے پھول چن چن کر ان کے ملاحظے میں پیش کیے جائیں۔ شورش ابھی خدا کے فضل سے جوان ہے اس کی حیثیت شعر و ادب کے مرحلے میں تازہ واردگی ہے تاہم اس کا دامن ان جواہر پاروں سے مزین ہے وہ ایسے ہیں کہ کہنہ مشق سخنور بھی انھیں باعثِ فخر سمجھیں

باش تا صبحِ دولتت بدمد — کیں ہنوز از نتیجۂ سحر است

دعا ہے اللہ تعالیٰ اسے عمرِ طویل عطا کرے، اس ذوق و شوق، حسنِ فکر، سلامتِ احساس اور جذبۂ اصلاح کو پختگی و استواری بخشے۔ آمین!

غلام رسول مہر

مسلم ٹاؤن، ۲۸ فروری ۱۹۵۶ء

ناگفتنی

فاطمی خاندان کے خلیفہ اوّل المعز لدین اللہ پہلی دفعہ مصر میں داخل ہوئے تو ان سے ایک بہت بڑے عالم ابن طبا طبا نے سوال کیا۔

"امیر المومنین، آپ کا حسب نسب کیا ہے ---؟"

خلیفہ نے کہا ـــــ "میں عنقریب دربار منعقد کروں گا، آپ کو اس کا جواب وہاں مل جائے گا۔" دربار لگا ـــــ خلیفہ معز کو ابن طبا طبا کا سوال یاد تھا ـــــ نیام سے تلوار کھینچی۔ ہوا میں لہرائی اور کہا :

"یہ میرا نسب ہے ----!"

پھر حاضرین میں اشرفیاں لٹائیں اور کہا۔

"یہ میرا حسب ہے ----!"

اس مجموعے کو ترتیب دیتے وقت میرے ذہن میں ایک عجیب سا کانٹا تھا اور ابھی تک اس کانٹے کی چبھن باقی ہے ـــــ غرض سوال یہ تھا کہ یہ اشعار کسی مجموعہ کے قابل بھی ہیں یا نہیں؟ بالفرض کسی نے ان کا حسب نسب پوچھ لیا تو جواب کیا ہوگا ---؟ کسی مکتبۂ فکر سے میرا

تعلق نہیں، کوئی ادبی جتھے بندی میری پشتیبان نہیں اور نہ کسی شعری طائفے سے مجھے کوئی علاقہ ہے نظر بہ ظاہر میں اس وادی میں (بہمہ وجوہ) نووارد ہوں۔ جہاں تک شعر گوئی کے ذوق کا تعلق ہے اس کی عمر بائیس تئیس برس کے لگ بھگ ہے لیکن واقعۃً شعر گوئی کا زمانہ ایک تہائی ہے۔ اسکول چھوڑا تو چند دن اُستاد مرحوم نیاز احمد نیازؔ کی ہم نشینی کے باعث تُک بندی کا شوق قلم گیر رہا لیکن سیاسی اُفتاد کی گرفت نے بہت جلد پانسہ پلٹ ڈالا —— آخر کار وہ سکون ناپید ہو گیا جس سے عشق کا گداز شعر کی صورت اختیار کرتا ہے۔ شعر کہنے کے لیے ایک خاص قسم کے جمالیاتی ماحول اور ہم کلام تنہائی کی ضرورت ہے۔ سیاسی اشغال نے پورے خرمن میں آگ لگا دی۔ نتیجہ معلوم کہ شعر و سیاست پنبہ و آتش ہو گئے۔ بالفاظِ غالبؔ ع

آگ اس گھر میں لگی ایسی کہ جو تھا جل گیا

شعر کا تعلق دل سے ہے اور دل بھی دلِ گداختہ —— تب کہیں ہوتی اک مصرعِ تر کی صورت —— اس کے برعکس سیاست اپنے پہلو میں دل نہیں رکھتی۔ تقریباً پندرہ برس سیاست میں غارت ہو گئے۔ اس اثنا میں کبھی کبھار شعر ہوتے رہے لیکن خال خال ع

جیسے ویرانے میں چپکے سے بہار آجائے

"چٹان" نکلا تو زندگی ایک نئے موڑ پر آ گئی۔ سیاسی شاعری کا اخباری انداز دماغ و دل کو محیط رہا لیکن درمیان میں چند دن —— "جوانی چناں کہ اُفتد دانی" —— نے بھی راہ پائی —— وہ چیز جو شعر کہلاتی ہے جذبات میں کروٹیں لینے لگی۔ کئی اثرات جو ذہن میں پہلے سے مترتب تھے ایک دوسرے سے پیوست ہو کر مصرعوں میں ڈھلنے لگے۔ گویا مصرعوں کی اس ڈھلائی کا نام گفتنی و ناگفتنی ہے اور یہی ان کا حسب نسب ہے۔ اس مجموعہ میں جتنی غزلیں یا نظمیں بھی آپ دیکھیں گے ان کی عمر دو چار برس سے زیادہ نہیں

ممکن تھا میں انھیں کبھی اکٹھا نہ کرتا۔ ان کی اشاعت کا سوال تو کبھی میرے زیرِ غور نہیں رہا مجھے یقین ہے کہ اس کی اشاعت سے ادبی افق پر کوئی نیا آفتاب طلوع نہ ہوگا اور نہ لوگ ہی اس کے لیے ہمہ شوق ہیں یہ مجموعہ میرے ذاتی ذوق کی اُپج ہے یا یہ کہ لیجئے کہ قلم کی شوخ چشمی، سوچا اور ترتیب دے لیا۔ اس میں ناگفتنی وافر اور گفتنی کمتر ہے۔ آغاز میں میر انیس کا یہ مصرع اس لیے طرازِ عنوان ہے کہ ——— ع ——— "چراغ لے کے کہاں سامنے ہوا کے چلے"

وہ تمام اشعار جو اس مجموعہ میں درج ہیں کسی فکر کے "غیاب و حضور" کا نتیجہ نہیں حقیقتاً حادثاتی اور سانحاتی ہیں۔ کوئی خیال اُبھرا، شعر ہو گیا۔ کوئی لہر اٹھی مصرع بن گئی۔ کوئی سانحہ ہُوا موزوں ہو گیا۔ کوئی تصویر نظر پڑی، نظم میں ڈھل گئی اور رنگ و روغن ——— مطلع سے مقطع تک پہنچ گئے۔ یہی وجہ ہے کہ اس میں جذبات کی بوقلمونی بدرجۂ آخر موجود ہے اور اظہار کا سانچا ایک حد تک خطابت میں ڈھلا ہُوا ہے ——— میں نے شاعری کو شاعری کی حیثیت سے کبھی اختیار نہیں کیا۔ اس کے برعکس شاعری نے مجھے اختیار کرنے کی کوشش ضرور کی، لیکن تشنہ ——— ممکن ہے تشنہ کا لفظ یہاں بے محل ہو مگر اتنا واقعہ ضرور ہے کہ میں نے اس سے فرار اختیار کیا۔ شعر ڈھالے نہیں، ان میں ڈھلا ہوں پھر جو راستہ اختیار کیا وہ اتنا بے ڈھب تھا کہ شاعری کو ساتھ لے کر چلنا طرفہ تماشہ سے کم نہ تھا۔ ——— ظاہر ہے کہ شاعری کا ملکہ وہبی ہوتا ہے۔ قدرت نے مجھے اس سے محروم نہ رکھا میں چاہتا تو فنی ریاضت اور شعری عبادت سے کسی ادبی بُت کدے میں پرستش نہ سہی پرستش کی جگہ ضرور حاصل کر لیتا لیکن شعر سے ہاتھ اُٹھایا اور سیاست سے معانقہ کیا تو معاملہ کا میدان ہی بدل گیا۔ ایک طرف رُخسار و کاکل ——— دوسری طرف طوق و سلاسل۔ اُدھر حسن و عشق کے وَلولے، اِدھر قید و بند کے مرحلے۔ دس برس جیل خانوں کی نذر ہو گئے۔ دل کی اذیتیں جسم پر بیت گئیں۔ پھر جب رات نے سیاہ بالوں کو لپیٹا اور صبح نے اُجالا کیا تو سیاست طوائف کا پہلو نکلی ہُوا یہ کہ ادب کو میں نے کھو دیا

اور سیاست نے مجھے ـــــ اب سفید بالوں اور گنجلک جھریوں کو ساتھ لے کر شاعری کے بازار میں نکلنا جسارت ہے یا خوبانِ شہر کو دعوتِ استہزا ـــــ!

شعر کی خاصیت و ماہیت پر صفحوں کے صفحے سیاہ ہو چکے ہیں۔ عام کتابی تعریفوں سے قطع نظر شعر خود بولتا ہے کہ وہ کیا ہے۔ وہ محض جذبہ یا فن ہی نہیں بلکہ جذبہ و فن کا جوہر اور اس سے بھی ماورا، وہ تخیّل کی معراج ہے جو دیوانگی میں قیس و فرہاد اور فرزانگی میں میر و غالب کو حاصل ہوتی ہے لیکن تخیّل کی یہ معراج ہر کسی کے حصّے میں نہیں آتی۔ یہ منجملہ عطیاتِ ربّانی ہے۔

شاعری کے متعلق دوسرا خیال یہ ہے کہ جب کوئی قوم اپنے خصائص کھو بیٹھتی ہے اور اس کے قوائے عمل مضمحل ہو جاتے ہیں تو وہ دماغی آرائشوں کے لیے جو عیش خانے تعمیر کرتی ہیں ان میں ایک شاعری بھی ہے

علامہ مشرقی نے (ممکن ہے نقادِ شعر و شاعری کے ضمن میں ان کا نام پڑھ کر چونکیں) خریطہ میں ہر شاعر کو اس قوم کے انحطاط کی تصویر کہا ہے جس میں وہ پیدا ہوا ہے۔ علامہ کے الفاظ میں ایسا شاعر:

"قوم کی درماندگیوں کا ایک وقتی اور مقامی مجسمہ۔ جذبات کے ہبوط کا ترجمان، صادق آہوں اور کراہوں کا مضراب ساز، بے ہوشیوں اور غفلتوں کا جہاں نما جام اور لاطائل حسرتوں کا سچا مورخ، سعیِ بے حاصل کا صحیح مخبر، شہوت و لذات کا طبلِ پُر ہنگام، تعلّیانہ خود نمائیوں کا عکسِ آئینہ اور سلب شدہ عظمتوں کا نوحہ گر ہے"

یہ خیال بظاہر بڑا ہی سنگدلانہ ہے لیکن اس سے انکار نہیں کہ شاعری کے قصیدہ نگاروں نے اسے قومی زندگی کی جس "قوت" سے تعبیر کیا ہے اس کا سرچشمہ بھی انحطاط ہی ہے۔ پھر وہ کوئی ایسی طاقت نہیں کہ اس کے بغیر قوم و ملک کی شریانوں کا لہو حرارت کھو بیٹھے۔ وہ بہر حال جاذوں کا

آتش دان یا انگیٹھی ہے جس سے بدن کو گرمائی پہنچتی ہے۔

آج تک مختلف اقوام میں جو بڑے شاعر ہوئے ہیں، وہ سب کے سب (الّا ماشاء اللہ) ادبار و زوال کے زمانے میں ان کے ساتھ جو اجتماعی خصوصیتیں چپکا دی گئیں وہ بڑی حد تک فرضی تھیں شعر نے کبھی اجتماعی کردار پیدا نہیں کیا۔ وہ زیادہ سے زیادہ کسی تحریک کا منادی رہا یا کسی خاص ہنگامے کا محرک یا عکاس لے دے کے دو چار مثالیں اس کلیہ سے مستثنیٰ ضرور ہیں، مثلاً جرمنی میں گوئٹے، انگلستان میں بائرن اور یہاں اس دور میں اقبال؟ ——— (بہ تصرف ادنیٰ) ——— ۵

اک ولولۂ تازہ دیا اس نے دلوں کو

لاہور سے تا خاکِ بخارا و سمرقند

لیکن اقبال کو شاعر کہلانے سے آخر وقت تک انکار رہا۔ یہاں تک کہ وہ ان لوگوں کی ذہنیت کے خلاف میرِ اُمم سے دادخواہ ہوتے ہیں جو انھیں محض شاعر سمجھتے ہیں ان کے کلام کی جو چیز دلوں کو لبھاتی ہے وہ اُن کی شعریت نہیں اسلامیت ہے۔ وہ خود بھی شعر کو انحطاط ہی کی پیداوار خیال کرتے تھے !!

مولانا: الطاف حسین حالی نے اپنے مقدمہ میں شعر کی تاثیر بیان کرتے ہوئے عرب کے جاہلی شعرا کا ذکر کیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ وہ ہنگامہ رستخیز پیدا کرنے میں ید طولیٰ رکھتے تھے لیکن ان کی ترمیں بھی بہرحال سفلی جذبات ہی تھے، کوئی انسانی موقف یا اعلیٰ نصب العین نہ تھا۔

شعر کردار ہوتا تو غارِ حرا سے چاندنی نہ پھٹتی اور لات و عزّیٰ کے ساتھ شعر و شاعری کے بُت نہ ٹوٹتے لیکن یہ بُت ٹوٹے کیونکہ عربوں کو جن اجتماعی خرابیوں نے گھیر رکھا تھا ان میں شاعری اور ساحری بھی شریک تھیں اہل عرب ساحروں اور شاعروں کے دام میں بُری طرح پھنسے ہوئے تھے شاعروں کا کوئی درجہ ہوتا اور وہ معاشرے کو شر سے سنوارتے تو قرآن مجید انھیں یا ان کے پیروؤں کو گمراہ نہ کہتا۔

چونکہ ہمارے ہاں الفاظ کے معانی پر شاذ ہی غور ہوتا ہے، اس لیے ہم محض الفاظ کی جسامت سے

ان کے حسن و قبح کا اندازہ لگاتے ہیں۔ ہم نے "گمراہ" کو قرآن مجید کا ایک بول سمجھا، حالانکہ یہ بول نہیں تھا۔ بلکہ مومن و غیر مومن کے درمیان خطِ امتیاز تھا۔ صحیح راستہ اور امر غلط راستہ تو اہی، مذہب کے لغوی معنی سڑک کے ہیں جس سے جزا و سزا تک پہنچتے ہیں وہ لوگ جنہیں مذہب کا ذہن عزیز ہے۔ اکثر جواز شعر کے لیے مختلف روایتیں، حدیثیں، حکایتیں اور تعبیریں گھڑتے یا لاتے ہیں اور اب تو قومی و سیاسی شاعری نے شعر کی صورت ہی بدل دی ہے۔ یعنی حرمتِ شعر کا تصور ہی خارج از بحث ہو چکا ہے مگر اپنی جگہ یہ بات غور طلب ہے کہ اس کی مضرتیں زیادہ ہیں یا منفعتیں! ——

مولانا ابوالکلام آزاد نے اس ادبی مجادلے کے نفع و ضرر پر اسلامی نقطۂ نگاہ سے بعض پتے کی باتیں کہی ہیں فرماتے ہیں:-

اس بات کی عام طور پر شہرت ہو گئی ہے کہ اسلام کا دینی مزاج فنونِ لطیفہ کے خلاف ہے اور موسیقی محرماتِ شرعیہ میں داخل ہے حالانکہ اس کی اصلیت اس سے کچھ زیادہ نہیں کہ فقہانے ردِّ وسائل کے خیال سے اس بارے میں تشدد کیا اور یہ تشدد بھی بابِ قضا سے تھا نہ کہ بابِ تشریع سے —— قضا کا میدان نہایت وسیع ہے ہر چیز جو سوءِ استعمال سے کسی مفسد کا وسیلہ بن جائے تو قضاً روکی جا سکتی ہے لیکن اس کی تشریع کا حکم اصلی اپنی جگہ سے نہیں ہل سکتا

قوموں کے عروج و ترقی کے زمانہ میں جو اشتغال تحسینِ فکر اور تحسینِ طبع کا باعث ہوتا ہے وہی تنزل میں فکر کے لیے فتنہ اور طبیعت کے لیے مہلکہ بن جاتا ہے۔ ایک ہی چیز حسنِ استعمال اور اعتدال سے فضل و کمال کا زیور ہوتی ہے اور سوءِ استعمال اور افراط و تفریطِ عمل سے بداخلاقی و بدعملی کا دھبہ بن جاتی ہے۔ موسیقی کا ایک شوق اکبر کو تھا کہ اپنی یلغاروں کے بعد جب گھر لوٹتا تو مجلس سماع و

نشاط سے ان کی تھکن مٹاتا ــــ پھر ایک شوق محمد شاہ رنگیلے کو تھا کہ جب تک
محل کی عورتیں اسے دھکیل دھکیل کر پردہ سے باہر نہ کر دیتیں۔ دیوان خانے میں
قدم نہ رکھتا ــــــــ" (غبارِ خاطر، آخری خط)

یہ الفاظ اپنی شرح آپ ہیں مثلاً

۱۔ اس سے اس متشدد ذہن کی تغلیط ہوتی ہے جو شاعری کے سوءِ استعمال کی اجتماعی مضرتوں (جن سے تاریخ کا کوئی صفحہ خالی نہیں) کے پیشِ نظر شاعری ہی کو معدوم کر دینے کا داعی ہے

۲۔ اسلام نے جن حالات میں شاعروں کی پیروی کو گمراہی سے تعبیر کیا وہ حالات بجائے خود اتنے خراب تھے کہ شاعری کے ضرر نے انھیں اور بھی خراب کر رکھا تھا۔

۳۔ چونکہ شعر کا نشو اکثر انحطاط کے دور میں ہوتا ہے بالخصوص مشرقی شعر جو محض مسکنت کی پیداوار ہے اس لیے تحسینِ فکر اور تحسینِ طبع کے بجائے اس میں فتنۂ فکر اور مہلکہ طبیعت کا عنصر غالب ہے

۴۔ اسلام میں شعر کی حرمت کے بارے میں کوئی نص صریح نہیں۔ قرآن مجید نے جن مفسدوں کا جائزہ لیا۔ ان میں شعر کا سوءِ استعمال بھی تھا ــــ اہلِ عرب آیاتِ قرآنی کو شعر کہتے تھے اور یہ منشائے نبوّت کے خلاف تھا۔ قرآن نے اس کی تردید کی اور شاعری کے جاہلی ادعا کو گمراہی سے تعبیر کیا۔

۵۔ دوسرے فنونِ لطیفہ کی طرح شعر کی ملامت بابِ قضا سے ہے نہ کہ بابِ تشریع سے۔ اسلام ہر اس چیز پر قدغن لگانے کی اجازت دیتا ہے۔ جس سے معاشرے میں اختلال پیدا ہو
شاعری میں اس اختلال کے جراثیم ہی نہیں بلکہ وقائع وشواہد سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ اس میں خسران کی خصوصیتیں زیادہ ہیں

۶۔ شاعری میں اکبر شاذ اور رنگیلے ہمیشہ ہوتے ہیں۔ ہوتا یہ ہے کہ ملکی فتح مندیوں میں

اکبر پہلے اور رنگیلے بعد میں آتے ہیں لیکن شاعری میں رنگیلے پہلے اور سجیلے بعد میں اردو بھی سو برس سے نکلنے
محمد شاہ رنگیلے اور جانِ عالم ہوتے ہیں۔

ان مباحث سے قطع نظر شاعری انسانی فطرت میں جمالیاتی اعتبار سے اتنی رچ بس گئی ہے کہ اس کے بغیر معاشرے کی حیاتِ ادبی کا تصور ہی ممکن نہیں انسان کی تہذیبی یا ثقافتی زندگی کے جو مظاہر فی زمانہ مسلمات کا درجہ حاصل کر چکے ہیں ان میں شاعری سرفہرست ہے ——— !

اردو شاعری کا حسن استعمال انیسویں صدی کے ربع آخر سے ہوا غالب پہلا جی فی میں شاعر تھا جس نے قومی حادثوں سے آزردہ خاطر ہو کر رمز و ایما کا پیرایہ اختیار کیا۔ اس کا یہ شعر جس کا خیال مستعار ہے اس انقلاب کی پوری تصویر ہے جس کا سامراجی عرف ۱۸۵۷ء کا غدر ہے ؎

بوئے گل، نالۂ دل، دودِ چراغِ محفل

جو تری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا

غالب کے ہاں ایسے بہت سے شعر ہیں جن میں اس "غدر" کے حشر و انجام کی جھلکیاں مل جاتی ہیں ان کے بعد شاعری خلقی حیثیت سے کئی جگہ تقسیم ہو گئی۔ وہ شاعر جن کے لیے چبائے ہوئے نوالے اور پھٹے پرانے دوشالے متاعِ خسروی تھے۔ ادھر ادھر ریاستوں میں اُٹھ گئے اور اُفق کے تارے ٹوٹنے لگے لیکن اس پورے دور کا صحیح ورثہ حالی کو ملا جو غالب سے منتقل ہوا تھا۔ حالی نے رمز و ایما کو طاق پر رکھا اور گذارشِ احوالِ واقعی کا ساز اٹھایا۔

غالب ——— دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو ——— تھے، تو

حالی ——— میری سنو جو گوشِ نصیحت نیوش ہے!

اُن کے قدم بہ قدم لیکن خاصے فاصلے پر اود۔ وہ بھی ذرا شریر انداز کے ساتھ اکبر الہ آبادی نظر آتے ہیں کبھی پتۂ اصیل کی طرح ہنستے ہوئے کبھی ابرِ بہار کی طرح روتے ہوئے لیکن اپنی تمام شعری خصوصیتیں

کے باوصف ان میں احتجاج کی صدا ہے یا مصلح کی تلقین یا پھر ان تہذیبی سانحوں پر نالہ کشی جن سے مسلمان معاشرہ دوچار تھا۔

اسی دور میں "برمنہ گفتن" کی بعض دوسری تصویریں بھی نظر آتی ہیں، ان تصویروں کو اگر شعراء کے تذکرے میں صحیح جگہ نہ ملی یا ملی تو بہت مدھم اس کی وجہ ان کی دوسری امتیازی خصوصیتیں ہیں۔ مثلاً علامہ شبلیؔ جنہوں نے شعر سے بھی تاریخ کا کام لیا اور باقاعدہ ایک مدرسۂ خیال کی نیو رکھی۔ ان کے تعیّنِ مقام سے جدید تذکرہ نویسوں کا اغماض و اجتناب در اصل سیاسی انتقام کی ایک مجرمانہ حرکت ہے —— بہر حال حالیؔ کا اجتہاد اور اکبرؔ کا "احتجاج" ان کی زندگی ہی میں "انقلاب" کے دوراہے پر آگیا۔ قومی تحریک کے دھاروں نے شعر کو سرکش بنانا شروع کیا —— چکبستؔ و سرورؔ جہاں آبادی وطنیت کی آواز لے کر اُٹھے۔ مولانا محمد علی جوہرؔ نے گو تبرکاً ہی شعر کہے لیکن بے خوف ہو کر —— ظفر علی خاں ان سب سے بازی لے گئے۔ انہوں نے داغؔ کی پیروی میں معاملہ بندی کی لیکن عشق کی راہ میں نہیں، سیاست کی راہ میں۔ ان کے ہاں ہمیں ممدوح ملتے ہیں یا مجروح یا پھر مفتوح، ان کی بدیہہ گوئی بغایت سرکش ہے۔ وہ برمنہ گفتن سے بھی کئی منزل آگے نکل گئے —— قلم کو چابک بنایا، اور اشہبِ شعر پر ہجو کے سانٹوں سے قابو پالیا انہیں اس میدان میں شہسوار کا مرتبہ حاصل ہے۔

اُنہوں نے ہندوستانی مسلمانوں کی عوامی جمعیت کو جھنجھوڑا ہی نہیں بلکہ مشتعل کیا —— مگر غالبؔ کے بعد تحسینِ فکر اور تہذیبِ طبع کے ارتقا کا سہرا اقبالؔ کے سر بندھا۔ اقبالؔ نے شاعری کے سوءِ استعمال کی بیخ کنی کی اور حسنِ استعمال سے اس کو فضل و کمال پر پہنچایا۔ اس فضل و کمال کا سب سے بڑا اعتراف ہندوستانی مسلمانوں کی وہ ذہنی تحریکیں ہیں جن کا نشو و بلوغ خود پاکستان کی صورت میں موجود ہے۔

اقبالؔ نے بلاشبہ کئی کروڑ انسانوں کو بالواسطہ اور بلاواسطہ متاثر اور شاید پوری تاریخ انسانی میں اس لحاظ سے اتنا بڑا شاعر کوئی نہیں۔

اس چشمۂ صافی سے کئی سوتے پھوٹے، لیکن ہر سوتے کا بہاؤ مختلف سے مختلف ہوتا گیا۔ جن میں دیر تک زندہ رہنے کی خصوصیتیں ہیں وہ علی الترتیب جوشؔ، احسانؔ دانش اور فیض احمد فیضؔ ہیں، جوشؔ "ہندوستان چھوڑدو" (Quit India) کا شاعر ہے، اس نے بہت کچھ کہا ہے، لیکن جو کچھ کہا، اس میں سکون زیادہ توازن کم ہے۔ اصلاً وہ قومی تحریک کے اس دور کا شاعر ہے، جب ساری صورتِ حالات منفی ہوتی ہے، اور اثباتی قدریں الشاذ کالمعدوم۔ اسی لئے اس کی شاعری میں نفرت اور نراج کا خطیبانہ غلو ہے، وہ ایک بانکا پھکیت ہے جس کے الفاظ غصّہ کی ضربوں کے مانند بے قابو ہیں۔

احسانؔ دانش مصوّر شاعر ہے۔ لیکن ان انجمن ہائے ستائش باہمی کے صرف نظر کا زخم خوردہ، جن کا ادبی شیوہ ہے کہ پندرہ بیس غزلوں اور سولہ سترہ نظموں کا ایک شاعر پیدا کریں۔ کاغذ کی فراوانی سے فائدہ اُٹھائیں، دل فریب طباعت، باصرہ نواز کتابت، ضخامت بڑھانے کے لئے اس پر موٹے گتّے کی جلد، اس کو سجانے کے لئے تجریدی آرٹ میں ہفت رنگ گردپوش۔ دوست یار، لیس کانٹا، ادھر مجموعہ نکلا اُدھر ستائش خوانی شروع ہوگئی ——— ہر خود غلط نقادوں کا ذہنی سمجھوتہ رنگ لایا ——— دیکھتی آنکھوں بونے قد آور ہوگئے۔

اور جن لوگوں نے شعر میں ریاضت کی وہ عطائی یا رجعتی! اور جو محض "مصرعے" تھے وہ دوستوں کی عنایت سے دوغزلے اور سہ غزلے مجتہد، لیکن تابہ کے؟ آخر ڈور کٹ گئی، جو محض غبارے تھے وہ پھٹ گئے، اور جو صرف "دیوالی" کے دیپے تھے وہ دن چڑھنے سے پہلے ہی بُجھ گئے، اب کسی کسی دیوار پر ان کے دُھوئیں کی سڑاند باقی ہے یا منڈیر کی اینٹوں پر تیل کے گدلے اور خشک دھبے جنہیں چڑھتے سورج کی دھوپ چاٹ رہی ہے۔

احسانؔ دانش نے پہلے پہل جوشؔ کا رنگ اختیار کیا۔ لیکن پھر مختلف سے منفرد ہوگئے آخر کار اقبالؔ کی راہ اختیار کی۔ وہاں اپنے آپ کو اسلامیت میں ڈھالا، مگر معاشرے کے ہر موڑ پر سرمایہ د

محنت کے تفاوت ہی کو مقدم رکھا لیکن وہ ترقی پسندوں کی طرح مشیت کو گالی نہیں دیتے بلکہ انسان کی اُن سنہری اور روپہلی بداعمالیوں پر قہقہے لگاتے ہیں جن میں تہ بہ تہ فوارۂ خون کی آمیزش ہوتی ہے۔

ان کے ہاں الفاظ کی گونج گرج اور مطالب کا شور و غل جوش سے کم نہیں۔ وہ الفاظ تراشنے استعارے باندھنے تشبیہیں اُٹھانے اور ترکیبیں گھڑنے میں بڑے مشاق ہیں ؎

سلیقہ انتہا کا چاہیئے موتی پرونے میں

فیض احمد فیض ترقی پسند تحریک کے شعری راہنما ہیں ان کے نظریوں کو جدلی مادیت کے گہرے مطالعے اور طبقاتی آویزش کے عمیق مشاہدے نے پروان چڑھایا ہے۔ ان کے ہاں عشق سے لے کر فرض تک کی ایک ہی لے ہے جس میں جوالا مکھی کا لاوا نہیں چتا کی آنچ ہے۔ انہوں نے نوجوانوں کے غضب ناک خیالات کی بڑی شدت سے عکاسی کی لیکن ان کا لہجہ حُدی خوانوں کا نہیں بلکہ سوختہ جانوں کا ہے۔ اُنہوں نے الفاظ کو معنوی اعتبار سے مجروح بھی کیا، لیکن توڑا نہیں موڑا ہے اُن کے ہاں جذبۂ احساس اتنے شدید ہیں کہ الفاظ سے بغاوت، عوام کے نزدیک کوئی معنی نہیں رکھتی۔

الغرض حالی و اکبر کے بعد اس دَور میں سن و سال کی تخصیص سے قطع نظر اقبال، ظفر علی خان، جوش، احسان اور فیض ایسے شاعر ہیں جن کے ہاں نہ صرف شعر کے حُسنِ استعمال کی نادر مثالیں موجود ہیں بلکہ ان کا وجود مختلف ادبی تحریکوں کا ماخذ اور شعری خصوصیتوں کا سنگھم رہا ہے اور دوسرے تمام شاعر اس میدان میں بقدرِ ظرف انہی سے متاثر ہیں ——!!

اُدھر غزل نے بھی اپنا چراغ روشن رکھا یعنی مخاصمت و مخالفت کے باوجود اپنا پنڈ نہ چھوڑا اس پر ہر طرف سے تابڑ توڑ حملے ہوتے رہے لیکن سخت جان نکلی۔ آخر ققنس کی طرح اپنی خاکستر سے بال و پر پیدا کر لیئے۔ حتیٰ کہ سدرۃ المنتہیٰ تک جا پہنچی۔ اس میں شک نہیں کہ غالب کے بعد ۱۸۵۷ء کی سادھستی میں غزل کا مزاج بالکل ہی مختل ہو گیا، یہاں تک کہ اس کا سر و سامان اوچھے

الفاظ اور بھدے سے مطالب کے اعادہ و تکرار میں تھا لیکن ان پھٹے حالوں میں بھی نشاۃ ثانیہ کے لئے جیتی رہی۔ پہلی جنگِ عظیم کے بعد اس نے ایسی مار کھائی کہ بسا اوقات شمع سحر ہوگئی۔

حالی کے حملے بہر حال گوارا تھے کیونکہ وہ غزل کے وجود پر نہیں اس کے مظاہر پر معترض تھے انہیں نوحہ غم ہی نغمۂ شادی جھیڑنا قبول نہ تھا۔ وہ شاعری کے زنخےپن پر آزردہ تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ دہلی و لکھنؤ کے دربار اپنے پیچھے غدار نوابوں کی ریاستیں، خواجہ سراؤں کے طائفے اور شاعروں کی ٹولیاں چھوڑ گئے ہیں۔ وہ زوال کے ان معنوی فرزندوں کی ذریات کے کرتوت سے بھی آگاہ تھے۔ جونہی سرسید کی رفاقت نے انہیں انگیز دیا وہ لسانی آوارگی اور ادبی عیاشی کے اُس عنکبوتی شہر پر حملہ آور ہو گئے جس کا نام غزل تھا لیکن حقیقتاً اُسے غزل سے کوئی علاقہ نہ تھا۔ وہ ایک ایسی عمارت کو ڈھا دینا چاہتے تھے جس میں غزل کی عفت کا بھاؤ چکتا تھا وہ محض کسبی غزل کے خلاف تھے انہوں نے جو کچھ لکھا بڑے رکھ رکھاؤ سے ——— ترازو میں تلا ہوا۔ ان کا مخاطب انہیں کہیں بھی غصہ میں نہیں پاتا۔ لیکن جوش تو سیاسی محاورے کے مطابق توڑ پھوڑ اور ساڑھ پھونک کی پالیسی پر اُتر آئے۔ ایک اچھا غزل گو ہونے کے باوصف انہوں نے غزل پر ہلّہ بولنا شروع کر دیا۔ نوجوان خون جو پہلے ہی باغی ہو رہا تھا، اُن کا ہمنوا ہو گیا۔ اس قبولِ عام نے عجیب غریب گل کھلائے۔ جوش نے تو پرانے عقیدوں اور پرانی قدروں ہی سے ہاتھ اُٹھایا تھا۔ نئی پود نے پھاوڑے اُٹھا کر عمارتیں ہی ڈھانی شروع کر دیں۔ غزل کی عداوت میں نظم کا پیراہن بھی چاک کر ڈالا۔

غرض دوسری جنگِ عظیم میں تغیرِ ہیئت کے تجربے نے زور پکڑا اس تجربے کی کوکھ سے نظمِ معرّیٰ اور نظمِ آزاد نے جنم لیا جس سے بعض شگفتہ مصرعے انفراداً اور اجتماعاً موزوں تو ہو گئے لیکن نظم و نثر کا بنیادی امتیاز کھو کر ———! جن نوجوانوں نے اس میدان میں اجتہاد کیا وہ اہمال و ابہام کی وادی میں بہت دُور نکل گئے انہیں اس کا احساس ہی نہ رہا کہ شعر میں بھونڈا پن جرم ہے اس کھیپ کا بیشتر

سرمایہ بہمہ وجوہ قابلِ اعتنا نہیں۔ ان کے نزدیک شعر غالباً ـــــ "سہیلی ! بوجھ پہیلی ـــــ" قسم کی کوئی چیز ہے یا ریاضی، الجبرا، جیومیٹری کا کوئی سوال ـــــ لطف کی بات یہ ہے کہ ان لوگوں میں خیال کے اعتبار سے وحدت کا کوئی رشتہ نہیں۔ ایک ہی شے مشترک ہے وہ کلاسیکی شاعری سے ان کا بُعد ـــــ عجیب بات یہ ہے کہ خود ان میں بھی کئی گروہ ہیں جن میں باہمی تصادم ہے۔ وہ لوگ جو نفسیاتی مطالعہ اور جنسی کجروی میں زندگی بسر کرتے ہیں، ان کا ذکر بے کار ہے۔ وہ شعلۂ مستعجل ہیں، ہم انہیں زیادہ سے زیادہ شعری میتوں کا نام دے سکتے ہیں انہیں غالباً اس کا احساس ہی نہیں کہ کوئی بدعت بھی جدت نہیں ہوتی۔ شعری ہیئت سے علاقائی آب و ہوا اور لسانی مزاج و طبیعت کا خلقی رشتہ ہے۔ ان لوگوں کا غزل و نظم کے مشرقی روپ سے فرار دراصل ان کے فکر کی ژولیدگی کا نتیجہ ہے۔ ان میں ترقی پسندوں کا گروہ یقیناً ایسا ہے جو ایک نیا ذہن، نیا جذبہ اور نیا احساس لے کر اُٹھا لیکن فیض اور اس کے دو چار خوشہ چینوں کو چھوڑ کر اکثریت ان لوگوں پر مشتمل ہے جن کا ذہن مستعار ہے اور زبان اُدھار۔ یہ لوگ جتنا عوام کا ذکر کرتے ہیں، اتنے عوام سے واقف نہیں ان کی بڑی خوبی درشت گوئی اور بڑا عیب فکر و مشاہدہ کی کمی ہے، ان کے ہاں تقلید، اخذ، توارد زیادہ ہے۔ چونکہ ان لوگوں نے جو کچھ کہا، وہ درآمد کیا ہے اس لئے ان میں زیادہ تر وہ لوگ ہیں جو حادثوں یا سانحوں سے گذرے نہیں بلکہ ان کی تجارت کرتے ہیں۔ یہ ایک طرز پر تجارتی ادارہ ہے جو پہلے اپنے مال کی ضرورت اور مانگ پیدا کرتا پھر گاہک کی کمزوری سے فائدہ اُٹھاتا ہے "عوام سستی اور کافی مسکرات چاہتے ہیں ادیب سستی اور کافی شہرت چاہتا ہے" ـــــ ترقی پسند تحریک اشتمالی چھاپ کے بعد اسی نہج پر آگئی ہے ـــــ لوگ شعر میں نعرہ بازی بھی گوارا کر لیتے ہیں لیکن ہلڑبازی نہیں۔ ترقی پسندوں نے (الا ماشاء اللہ) جب سے ادب شعر کو ایک خاص فلسفے اور خاص ملک کی سیاست کے تابع کیا ہے ان کی ادبی وقعت ہی جاتی رہی ہے۔ وہ شاعر نہیں رہے، پرچارک ہو گئے ہیں چنانچہ ان کی تحریک کا زور ٹوٹ رہا ہے اور وہ ایک چلا ہوا کارتوس ہو گئے ہیں انہیں احساس ہو چلا ہے کہ اب

ان کے پاس کہنے کو کچھ نہیں رہا لیکن اپنی اس بے بضاعتی کو چھپانے کے لئے وہ کبھی پاکستان اور ہندوستان کی حکومتوں پر الزام دھرتے ہیں کہ وہ انہیں کہنے سے روکتی ہیں اور کبھی سرکاری احتساب کے خود اختیاری خوف کو گالی دے کر بزعم خویش سرخرو ہوتے ہیں ——— !

——— عیب مے جملہ بگفتی ہنرش نیز بگو! ——— یہ بھی واقعہ ہے کہ ترقی پسند ادیبوں نے "عوام" کو "خواص" سے آنکھیں ملانے کی جرأت دلائی، اور ادب و شعر سے مفاسد و عوارض کو خارج کیا ہے، مگر ان کی تحریک میں اثبات کے بجائے نفی کے پہلو عام ہیں۔ انہوں نے اپنی عظیم الشان ہماہمی کے باوجود کوئی میرؔ، غالبؔ، اقبالؔ پیدا نہیں کیا، ان کی صفوں میں ایک بھی حالیؔ، اکبرؔ اور ظفر علی خان نہیں۔ سردار جعفری نے "ترقی پسند ادب" میں بعض کھلونوں کو بڑا بنانے کی کوشش کی ہے، مثلاً مجروح سلطانپوری اور کیفی اعظمی، لیکن ان کا حدود اربعہ بس اتنا ہے کہ شاعری کے مدرسہ میں کند ذہن طالب علم ہیں ——— خود سردار جعفری اپنی تحریک کے حالی بننا چاہتے ہیں لیکن غور کرنے سے ان کا اپنا وجود محلِ نظر ہو جاتا ہے۔

غرض انہی ناکام تجربوں نے غزل کی اہمیّت کو اُجاگر کیا۔ جب تک انسان گوشت پوست کا انسان ہے اور اس کے دل و دماغ کو حسن و عشق سے واسطہ ہے غزل زندہ ہے جوانی اور عشق یومِ الست سے صبحِ قیامت تک ہم قدم ہیں گو غزل کا وجود امتدادِ زمانہ سے معرضِ خطر میں رہا لیکن معرضِ فنا میں نہیں کیونکہ غزل انسانی فطرت کی خلقی افتاد کا ابدی اظہار ہے جو لوگ انقلابی شاعری کی آڑ میں اس کے خلاف لب کشا ہیں وہ اصلاً اپنے دہاڑتے ہوئے مصرعوں اور تڑانتے ہوئے شعروں کا جواز پیدا کرنا چاہتے ہیں ورنہ غزل ادب کی حیاتِ مستقلہ ہے۔ اس نے آبِ حیات پیا ہے ——— جہاں نظم کی نبضیں ڈوب جاتی اور فلسفہ کے اوسان خطا ہو جاتے ہیں وہاں غزل بولتی ہے۔ غزل کا ہر شعر نظم کہلا سکتا ہے لیکن نظم کا کوئی شعر بھی غزل نہیں ہوتا۔ وہ انسان کے جسم کو نہیں چھیڑتی، روح کو جھنجھوڑتی ہے اس کے مخاطب دماغ

نہیں دل ہیں ـــــ وہ واردات کی ہمجولی اور جذبات کی سہیلی ہے وہ ایک اپسرا ہے جس نے چاندنی کے فرش پر رقص کیا، ستارے بکھیرے۔ ان میں موسیقانہ لہر پیدا کی اور غزل کہلائی۔

اقبال وظفر علی خان کی رفتار اور حالی وجوش کی یلغار سے غزل کا سورج ایک حد تک گہنا گیا، یعنی اس سے قاری وسامع کی دل چسپی محدود ہو گئی لیکن تھوڑے عرصے کے لئے آخراس کا آفتاب اُبھرنے لگا۔

ولی، میر، سودا، درد، مظہر جان جاں، مصحفی، غالب، مومن، شیفتہ، آتش، حالی اور داغ کے بعد خود اقبال، شاد، چکبست، حسرت، فانی، یگانہ، احسان دانش، اصغر، جگر حفیظ، اثر اور فراق نے اس کو چار چاند لگا دیئے، اساتذہ کا یہ رنگ قدرے شوخ ہو کر بعض نوجوانوں میں منتقل ہوا، جن میں عابد علی عابد، سیف الدین سیف، ناصر کاظمی، قیوم نظر، احمد ندیم قاسمی معین الدین جذبی، ساحر لدھیانوی، اسرار الحق مجاز، عبد الحمید عدم اور ظہیر کاشمیری معروف ہیں۔

بظاہر داغ کے بعد غزل کو جینا نہ چاہیئے تھا لیکن حسرت نے جو سنبھالا دیا پھر اصغر گونڈوی اور فانی بدایونی نے جو شکوہ پیدا کیا، اس سے غزل گونج اُٹھی۔ اُن کے ہم رکاب حفیظ جالندھری، جگر مراد آبادی اور احسان دانش بھی تھے۔ ان کی ساکھ سے غزل کی ساکھ بڑھی۔ فراق نے اس میں لوچ پیدا کیا، جن نوجوانوں کو اب شہرت ہوئی ہے ان میں عدم کے ہاں تیکھا پن ہے، لیکن خرابات کے لبعد تلچھٹ زیادہ ہے۔ ناصر کاظمی میں بڑی جان ہے لیکن ظہیر کاشمیری میں عمق ہے۔ قاسمی ہمہ گیر خصوصیت کے شاعر تھے مگر ان کی فکر اشتمالیت سے زنگ آلود ہو گئی۔ جذبی و مجاز اپنے تمام احترام کے باوجود تقریباً چالیس مصرعوں اور بیس شعروں کے شاعر ہیں۔ عابد علی عابد کے اُفق شعر پر مہتابی روشنی ہے لیکن سیف میں جو بات ہے وہ اُن کے کسی ہم عصر میں نہیں۔ حفیظ ہوشیار پوری کا نام تغزل میں سرِ فہرست آسکتا ہے، مگر اُنہیں ریڈیو نے گُم کر رکھا ہے ـــــ!

ایک شاعر کا ذکر ابھی تک اس سارے تذکرے میں نہیں آیا اور وہ اختر شیرانی ہیں وہ بظاہر رواجی غزل اور رواجی نظم دونوں کے شاعر تھے لیکن انہوں نے نہ صرف نظم میں تغزل سمویا بلکہ اپنے اجتہاد سے ایک ایسی راہ نکالی جس کے بانی اور خاتم بھی وہ خود ہی ہیں، انہوں نے عربی اور ہندی شاعری کی تقلید میں اُردو شاعری کو عورت کے تصوّر سے آشنا کیا جس سے پہلی دفعہ یہ بات منظر عام پر آئی کہ اُردو میں بھی عورت سے عشق ہو سکتا ہے، ان کا انداز اتنا منفرد ہے کہ اس کی ریس ناممکن ہے بعض نوجوانوں نے ابتدا میں نقل اُتارنا چاہی لیکن بالآخر سپر انداز ہو گئے بلکہ اپنی راہ بھی بھول گئے۔

جن شعرا نے راقم کے ذوقِ شعر پر اثر ڈالا ان میں اختر شیرانی بھی ہیں۔ ہیں ہی نہیں بلکہ چھائے ہوئے ہیں۔ مرحوم اپنے سوا کسی کو شاعر نہ مانتے تھے۔ یہ 'انا' تقریباً ہر شاعر میں ہوتی ہیں' اختر شیرانی تو بہر حال اختر شیرانی تھے، انہوں نے جتنے موضوع انتخاب کئے اتنے ہی ریشمی الفاظ چنے۔ ان کا شعری عقیدہ تھا کہ نظم یا غزل، موضوع یا مضمون اپنے لیئے خاص قسم کے الفاظ چاہتے ہیں' ان کے نزدیک غزل، نظم، قصیدہ، ہجو، مرثیہ ان سب کی زبانیں مختلف تھیں وہ پہلے صورت پر زور دیتے پھر سیرت کو لیتے! ان کی نظموں کی واحد خصوصیت یہ ہے کہ وہ ملائم سے ملائم الفاظ برتتے اور کنوارے کنوارے لہجے میں شعر کہتے ہیں۔

گفتنی و ناگفتنی کی بیشتر نظمیں اُن کے انداز پر ہیں۔ مثلاً ربعیہ پر جتنی نظمیں یا سانیٹ موزوں ہوئے ہیں ان کا سانچا اختر سے مستعار ہے۔ فرق یہ ہے کہ اس میں کہیں کہیں سیاست کی تلخی آگئی ہے، جو اختر کے ہاں عیب ہے۔ ان کے نزدیک سیاست اور عشق دو مختلف راستے تھے۔ میرے نزدیک ایک ہی تصویر کے دو رُخ ہیں۔ لیکن اختر کی سلمیٰ کا وجود ہے، ربعیہ کا کوئی وجود نہیں۔ وہ محض ایک شعری پیکر ہے، جسے حُسن کے احساس اور عشق کے اظہار نے ذہن کی جمالیاتی حسیات کے تحت تخلیق کیا ہے جن دنوں ربعیہ پر نغمہ سرائی کا زور تھا۔ اُن دنوں مختلف دوستوں نے مختلف افسانے تراش رکھے تھے۔ وہ اس ٹوہ میں دور تک نکل گئے کہ کہیں سے کوئی گھونگھٹ اُلٹیں اور ربعیہ کا چہرہ دیکھ لیں۔ لیکن اندھیرے میں

ٹامک ٹوئیاں مارنا بے معنی تھا۔ آخر انھیں کوچہ و بازار میں گھوم پھر کے ناکام لوٹنا پڑا۔ ربیحہ ممکن ہے کبھی کوئی وجود ہو لیکن جن دنوں یہ شعر کہے گئے اُن دنوں ایسا کوئی وجود نہ تھا، اور تھا تو افسانہ سازوں کے نہاں خانۂ دماغ میں۔ جو بلاوجہ تصویر آرائی میں محو تھے۔ اختر شیرانی کی ایک مشہور نظم کا ٹکڑا ہے —————— "عفت اور اس کے مظاہر کی کہانی یہ ہے" ——

—————— شاعروں کو نہ سنائی جائے

—————— جن احباب کو اب بھی ربیحہ کی تلاش ہو ان کے لیے یہ مصرع یا شعر "تمت بالخیر" ہے۔ اس اخفا سے یہ ثابت کرنا مقصود نہیں کہ جوانی اور اس کے تقاضوں نے زندگی کی دہلیز پر قدم نہیں رکھا۔ جوانی آئی اور پورے ساز و سامان کے ساتھ آئی۔ چاروں طرف لالہ و گل کا ہجوم رہا لیکن کسی مرحلے میں بھی حکایت شکایت نہ ہو سکی۔ میں سمجھتا ہوں۔ عورتیں غزل یا نظم میں گھسیٹنے کی چیز نہیں صرف پیار کی چیز ہیں اُن کا احترام کرو کہ آبگینے ہیں۔ ان کی محبت کو ٹھوکر نہ مارو کہ عورت زندگی میں ایک ہی دفعہ محبت کرتی ہے۔ انھیں کامیابی یا ناکامی دونوں صورتوں میں رسوا نہ کرو کہ رسوائی ان کی حجاب آلودہ پلکوں پر آنسو لے آتی ہے جن سے مہیب بد دعا نکلتی ہے۔ اختر شیرانی نے یونہی نہیں کہا تھا ع

اے نازنیں خدا کے لیے بد دعا نہ دے

اختر شیرانی کا یہ رنگ مجھے بجد عزیز ہے۔ میں نے اس طرز کی نظموں کو اس مجموعہ میں ایک الگ عنوان کے تحت ترتیب دیا ہے۔

تمام مجموعہ مختلف شعری عنوانوں کے تحت منضبط ہے ہر عنوان کی ایک ذوقی اور مزاجی کیفیت ہے جس سے خاص قسم کے رجحانات مترشح ہوتے ہیں —————— ع

طبع حسرت نے اٹھایا ہے ہر استاد سے فیض

روزنامہ "زمیندار" کے مطالعے نے اوائل عمری میں مجھے مولانا ظفر علی خاں کا گرویدہ بنا دیا۔ ادھر ان کی نظم چھپ کر آتی اُدھر نوکِ زبان ہو جاتی۔ رفتہ رفتہ یہی ذوق شعر گوئی میں ڈھل گیا۔ مدرسے کے اُستاد مولانا نیاز احمد نعمانی مرحوم نے دستگیری کی لیکن اس سے بھی پہلے تیسری یا چوتھی جماعت میں احسان دانش میرے ٹیوٹر رہ چکے تھے اور یہ شوق غیر شعوری طور پر موجود تھا۔ عمر آگے بڑھی تو شعر کہنے شروع کیے میں شعر کہتا۔ نیاز یا احسان اصلاح دیتے اور میں وہ شعر دوستوں میں بانٹ دیتا جنہیں وہ اپنے نام سے چھپوا لیتے۔ یہ وقت بھی بیت گیا۔ دسویں کے امتحان سے فارغ ہوا تو کالج کا سروسامان نہ تھا۔ کئی اذیتیں جسم و جاں کا احاطہ کیے ہوئے تھیں غرض سیاست کی انگلی پکڑی اور ہم رکاب ہو لیا۔ کئی سال تک چلتا رہا۔ ۱۹۳۵ء سے لے کر ۱۹۴۵ء تک یہ تمام عرصہ تقریباً جیل ہی میں کٹا۔ ادھر رہا ہوا، ادھر پکڑا گیا ؏

خورد افسوس زمانے کہ گرفتار نہ بود

۱۹۴۶ء میں احرار نے روزنامہ "آزاد" نکالا تو اس کی ادارت میرے سپرد کی گئی جس سے شعر گوئی کی خفتہ خواہشیں جاگ اٹھیں۔ اس پہلے سال میں دو چار دفعہ شعر ہوتے تھے۔ اب طبیعت کو پورے طور پر رعب پایا۔ تاثیر مرحوم نے انہی دنوں ایک خط میں کسی نظم کا ذکر کرتے ہوئے لکھا:-

"اپنی بیاض لے کر دہلی آجاؤ۔ شعر میں جو چیز ہونی چاہیے وہ تمہارے اندر کما حقہٗ نظر آرہی ہے صرف رکھ رکھاؤ کی ضرورت ہے۔ ہم آپس میں صلاح مشورے سے راہ پیدا کریں گے۔"

یہ الفاظ میرے شوق کے لیے مہمیز کا کام دے گئے۔ مصرع اٹھانے والی بات تھی۔ اختر شیرانی پہلے ہی ہونہار سمجھتے تھے۔ علامہ تاجور نجیب آبادی میری ایک نظم پر ماہنامہ "شاہکار" میں ایک طویل تنقیدی نوٹ لکھ چکے تھے۔ جس میں بعض ایسے تعریفی کلمات بھی تھے جن کا میں اہل نہ تھا۔ نگران سے میرا حوصلہ بڑھ گیا۔ مولانا عبدالمجید سالک سے نیاز مندانہ مراسم تھے۔ ان سے گاہے گاہے ملاقات ہوتی تو وہ

ادبی زندگی میں کود پڑنے کا مشورہ دیتے۔ ان کا خیال تھا کہ سیاسی زندگی کی لذتیں اُٹھائی ہیں تو اب ادبی زندگی کا لطف بھی لو۔

چنانچہ "چٹان" اس زندگی کا سرآغاز تھا۔ اب شعر کہنے شروع کیے تو سالک صاحب نے کچھ نظموں پر اصلاح فرمائی کہیں کسی نظم میں ایک آدھ لفظ بدل ڈالا یا فنی پہلوؤں پر نگاہ ڈال لی۔ اس طرح کئی شعری نکات ذہن میں محفوظ ہو گئے۔ جو شعر سیاسی زندگی میں کہے، وہ مولانا ظفر علی خاں کی نظر سے گذرتے رہے۔ ان کا بیش تر حصہ "زمیندار" میں چھپ چکا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ شعری ذوق کی پختگی اور فن کی نکتہ شناسی اصلاً انہی کا فیضانِ صحبت ہے اس باب میں میرا ان سے ذہنی تلمذ رہا۔ میں نے اُن سے بہت کچھ سیکھا اور اس کا اعتراف نہ کرنا کفرانِ نعمت ہے۔ اس مجموعہ کی زیادہ تر نظموں میں انہی کے پیرایۂ اظہار کی رُوح بولتی ہے۔ چراغ حسن حسرت مجھے اُن کا تتبع کہا کرتے۔ ہو سکتا ہے ان کی رائے میں مروّت ہو، بہر حال میرے لیے یہ وجہِ شرف ہے کہ میں نے ان کی خوشہ چینی کو اپنے لیے سعادت سمجھا۔

اس مجموعہ میں کوئی نظم ایسی نہیں جس کے لیے مجھے کئی دن یا کئی گھنٹے غلطاں رہنا پڑا ہو۔ بس شعر کہنے کے لیے ایک کیفیت کی ضرورت ہوتی ہے۔ ادھر وارد ہوئی اُدھر کھٹ سے شعر ہونے لگے۔ جس نظم میں آدھ یا پون گھنٹے سے زیادہ کا عرصہ اُٹھے ہیں وہ نظم کہہ ہی نہیں سکتا۔ لہٰذا وقتاً اس زحمت سے بچنے کے لیے میں نے اپنے ادھورے لیکن قیمتی سرمایہ کو برباد کیا ہے۔ اکثر نظمیں ارتجال کی یادگار اور بعض نظموں کا پس منظر اور پیش منظر نہایت دلچسپ ہے۔ مثلاً "مسجد و میخانہ" (صفحہ ۲۲۷) کا خیال "چٹان" میں چھپی ہوئی ایک عکسی تصویر سے پیدا ہوا۔ "اس بازار میں" "خرابیٔ عصمت کے مظاہر کا علم پہلے ہی سے تھا جن لوگوں کو اس ماحول کی جغرافیائی اور واقعاتی روداد سے آگاہی ہے ان کی شعری حس کے لیے اس سے زیادہ دل خراش سانحہ اور کوئی نہیں۔ عفت و گناہ کا یہ دور اُفتادہ شہر

اور شحنۂ شہر کے سوا ہر حساس طبیعت کو جھنجھوڑتا ہے۔ یہاں عشا کی نماز سے لے کر سحر کی اذان تک جو حشرِ معصیت گدلے سُرخ رنگ کے مینار اور گورے سفید رنگ کے گنبد دیکھتے ہیں، وہ صرف سنگ و خشت کا شکیب مسلسل ہی سہ سکتا ہے۔ اسی نظم میں یہی تاثر پیش کیا گیا ہے۔ "بھکارن" (صفحہ ۲۰۷) طوائف کے ماخذ پر صدائے احتجاج ہے۔ "مطالبہ" (صفحہ ۲۰۱) اسی احتجاج کا ایک مختلف زاویہ۔

جن لوگوں کی نظر سے میری کتاب "اُس بازار میں" گزری ہے، وہ مجھ سے اتفاق کریں گے کہ میرے دل میں عورت کی اس ارزانی پر اضطراب کے بہت سے انگارے ہیں۔ اس کتاب کی اشاعت سے میں نے اپنی سیاسی عزت کو بڑی حد تک مجروح کیا۔ کیونکہ لوگوں میں انسانی گوشت اپنے ذائقہ کے باعث بے حد مقبول ہے، پھر سیاست کے روز بازار میں تو اس گوشت کی خاصی مانگ ہے۔ میں نے اپنے آپ کو خطرہ میں جھونک کے جو کچھ محسوس کیا اس کی عکاسی کی۔ مجھے ایک لحظہ کے لیے اس کی پروا نہیں کہ میرے لیے دراز عبائیں کیا سوچتی ہیں یا ان لوگوں کی بارگاہِ اقدس کیا فتویٰ دیتی ہے۔ جن کی سیاسی زبانیں کترنی کی طرح چلتی ہیں۔

'گفتنی و ناگفتنی' کے بہت سے شعر انہی مجروح عصمتوں کی کہانی ہیں۔ اس مشاہدے میں نہ صرف آنسو ہی ڈھلے ہیں بلکہ بعض جگہ قطرہ ہائے خون کی آمیزش بھی ہے۔ "ردِ عمل" (صفحہ ۲۵۵) اسی ماحول کی ایک مختلف نظم ہے یہ اس سنگین تجربے اور تلخ مطالعے کا جذباتی عکس ہے جو مجھے ہی نہیں، مجھ ایسے سینکڑوں، بلکہ ہزاروں نوجوانوں کو منبر و محراب کی قربت سے دُور لے جاتا ہے۔ میرے شعر کہنے کے محرکات میں صورتِ حالات کا یہ پہلو خاصا نمایاں ہے۔

ایک سیاسی مسافر کی حیثیت سے میں نے جو کچھ دیکھا اُس کی تصویریں اتنی ڈراؤنی ہیں کہ اس دائرے کو "ڈیرے" سے تشبیہ دی جا سکتی ہے۔ فرق اتنا ہے کہ وہاں کچھ ڈیرے داریاں ہوتی ہیں جن کا کھرج نائکہ ہے پنچم رقاصہ۔ یہاں کھرج راہنما ہیں اور پنچم رضاکار، ورنہ عام حالت میں کسبیوں

کا زور ہے۔ مجموعہ کی پہلی نظم "غبارِ خاطر" (صفحہ ۵۱) اسی مشاہدے پر ایک کنایہ ہے۔ فی الاصل اس مجموعہ کا پیش لفظ جو کچھ زندگی میں دیکھا اور پڑھا، اُس کا خلاصہ۔ دوسری تمام نظمیں اس کی شرح و تفسیر ہیں۔ اس مجموعہ میں نوّے فی صد سیاسی نظمیں ہیں جنھیں میں نے آغاز میں جگہ دی ہے۔ یہ بات بڑی حد تک درست ہے کہ سیاسی نظمیں ایک مدّت کے بعد اپنی اہمیت و شہرت کھو دیتی اور صحیح شعر مستقل قدروں اور مستقل جذبوں ہی سے پیدا ہوتا ہے یا پھر سیاست ایک عارضی اور فانی جذبہ ہے لیکن اس احساس کے باوجود میں نے ان نظموں کو محض اس لیے مقدم رکھا کہ زندگی کا نصف ہیں، اگر میری زندگی میں سے سیاسی جدوجہد کا عنصر خارج ہو جائے تو پھر جو باقی رہتا ہے وہ کسی توجّہ کے قابل نہیں۔ مجھے گوناگوں تلخیوں اور بوقلموں رسوائیوں کے باوجود یہ متاع بڑی عزیز ہے۔ مجھے اسی سے برجستہ گوئی اور برجستہ گوئی کی دولت حاصل ہُوئی، وُہ جسارت ہاتھ آئی جس سے شاعرانہ زندگی تہی ہوتی ہے۔ میں اپنے آپ کو اس تہمت سے محفوظ سمجھتا ہوں کہ شاعر ناکارہ ہوتے اور ان میں کردار کی خصوصیت نہیں ہوتی۔ میں نے جو کچھ کہا اس پر عمل بھی کیا۔ ان سیاسی شعروں میں میرے کردار کی پوری پوری جھلک موجود ہے، میری خامیاں بھی ہیں اور خوبیاں بھی۔ یہاں مجھ میں قدرے انا جاگ اٹھتی ہے، جو شاعر مستعار انقلابی نعروں سے ہیرو بنتے ہیں مجھے نہ صرف ان سے ہمدردی پیدا ہوتی بلکہ اُن کے شیوۂ ستائش باہمی پر رحم آتا ہے۔ ان کا سارا گھمنڈ، خود فریبی کے کھوکھلے دعووں پر ہے۔ جن لوگوں کو اپنے ملک کی سیاسی جدوجہد کے ابجد سے واقفیت نہیں اور جن عوام کا وہ نام لیتے ہیں کبھی ان کے لیے کانٹے کی چبھن محسوس نہیں کی وہ انھیں تلوار کے زخم کھانے پر کیوں کر آمادہ کر سکتے ہیں۔ مجھے فخر ہے کہ میں نے عوام کو قریب سے پکارا اور انھوں نے قریب سے سُنا ہے۔ میرے ہر شعر کی بُنیادی خصوصیت یہ ہے کہ میں انہی کے لہجے میں بولتا اور انہی کے ذہن کی بات کہتا ہوں۔ مجھے اس مقصد کے لیے اپنے ماحول سے باہر کسی مزدور کا گلنار چہرہ دیکھنے کی ضرورت نہیں اور نہ پرائے دلیں سے

محرکاتِ شعر ڈھونڈنے کی احتیاج ہے، میرا ملک اور میری قوم ایک نظمِ مسلسل ہیں میں انہی میں سے موضوع مضمون اور عنوان ڈھونڈتا ہوں۔ میرے گرد و پیش اتنا مواد پڑا ہے کہ اس کے سامنے شاعر و ادیب ایک طرف ہے آفتاب و ماہتاب بھی دامن پھیلا سکتے ہیں ؎

دامانِ باغباں سے کفِ گل فروش تک!
بکھرے پڑے ہیں سینکڑوں عنواں مرے لیے

لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ مجھے بین الاقوامیت سے عار ہے یا میرا تصورِ وطنیت و قومیت ہیں محدود ہے یا میں جغرافیائی حدوں میں نسل و رنگ اور عقیدہ و خیال کی دھڑے بندیوں پہ اعتقاد رکھتا ہوں گو ان کا بھی ایک درجہ ہے اور کوئی مثالی سے مثالی انسان بھی اس سے باہر قدم نہیں رکھ سکتا لیکن مجھے جس بین الاقوامیت سے پرہیز ہے وہ نعرہ باز بین الاقوامیت ہے۔ جس سے شہرت طلب لیکن خام کار ادیب و شاعر نہ صرف متاثر ہیں بلکہ اپنی ادبی لَے میں مانگے تانگے کی اس بین الاقوامیت کے سیاسی داعی۔ آج انسان کی آڑ میں بہت کچھ کہا جا رہا ہے۔ ہمارے ہاں یہ ادبی مزاج بن چکا ہے کہ مذہب کا نام نہ لو۔ اس کا نام لینے سے عصمتِ شعر پر خراش آ جاتی ہے۔ بس گھڑی گھڑائی بین الاقوامیت جو کچھ پیش کرتی ہے اس کو قبول کر لو اور جذبہ و خیال کو سیاسی سانچے میں ڈھال لو، اس طرح نام بھی بلند ہو گا اور ستائش کار بھی مل جائیں گے میں خود ان لوگوں میں سے ہوں۔ جو شعر و ادب کو واقعۃً کسی مذہب، دین، عقیدے، فلسفے اور سیاسی خیال کی چیز نہیں سمجھتے بلکہ روشنی، ہوا اور پانی کی طرح اس کی اجتماعیت کے قائل ہیں۔ لیکن بہرکیف میں ایک مسلمان ہوں، مجھے اسلام سے دلبستگی ہے۔ علامہ اقبالؒ سے میری ارادت کا راز بھی یہی ہے کہ وہ اسلام سے شیفتگی رکھتے تھے اُن کے مطالعے سے میں نے نہ صرف ذہنی قوت حاصل کی بلکہ یقین کی دولت پائی۔ میری بہت سی نظموں میں اس کا اعتراف موجود ہے۔ میں نے انھیں ایک نظم میں "ہلالِ مشرق" لکھا ہے جو میرے نزدیک

موزوں خطاب ہے۔ دُوسری جگہ اُنھیں ایشیا کا کارل مارکس کہا ہے جو معناً غلط ہے کیونکہ دونوں میں بعد المشرقین ہے لیکن اس مماثلت کی غایت اس قدر ہے کہ بعض ہوئی طبیعتیں اس طرح چونک اٹھتی ہیں کہ

کہ زہر بھی کبھی کرتا ہے کارِ تریاقی

میری ان نظموں میں اقبال کا پرتو ہے ایک والہانہ جذبہ لیکن وہ علم نہیں جس کا سرچشمہ (سوز وساز رُومی" اور پیچ وتابِ رازی ہیں یہ تمام شعر دراصل "برہم زن" کی صدائے بازگشت ہیں چونکہ تقریباً سبھی نظمیں آزادئ ملک کے بعد لکھی گئی ہیں اس لیے ان میں مشتعل جذبات کی شدت اور بے ترتیب واقعات کا تسلسل ہے۔ ہر شخص جس کی نظریں ہنگامہ ہائے آزادی کے عواقب پر ہیں۔ ان میں واقعات کی کڑیاں ڈھونڈ لا سکتا ہے۔ کہیں انقلاب کو دعوت ہے کہیں انقلاب کے نتائج پر حیرانی اور کہیں خوش آوازہ جھنجلاہٹ جس میں یاس کا عنصر تک نہیں۔ غرضیکہ ہر نظم میں خواہ اس کی موضوعی حیثیت کتنی ہی انفرادی کیوں نہ ہو ایک اجتماعی اظہار کی رُوح پائی جاتی ہے ——————

سحر ہوئی تو گل و لالہ کا نشاں نہ رہا

اس مجموعہ کا طغرائے امتیاز ہے یا پھر ——————

ہزار حیف کوئی میر کارواں نہ رہا

اور حاصلِ کلام ——————

کہ جس کے ہم تھے عنادل وہ گلستاں نہ رہا

اسی احساس کے پیشِ نظر میں نے بعض خارا تراش نظمیں بھی کہی ہیں مثلاً سنگ میل (صفحہ ۶۶) نئے دَور کا فرمان (صفحہ ۶۹) اک ذرا صبر (صفحہ ۸۱)۔ سیاست (صفحہ ۲۷) رفت گذشت (صفحہ ۷۳)۔ صریر خامہ (صفحہ ۹۹)۔ رسائی (صفحہ ۱۰۰)۔ نا قدو (صفحہ ۱۰۷)۔ استفسار (۱۲۰)۔ گوروں کا قبرستان (۱۱۹)۔ انتخاب (۱۳۲)۔ یادِ ایام (صفحہ ۱۳۹)

قصیدے لکھو (صفحہ ۱۴۳) اور پانچ مصرعی قطعات (صفحہ ۲۶۴ سے صفحہ ۲۷۱ تک)۔

ہر شاعر کی فطرت ہے کہ وہ بعض خاص لفظوں، کنایوں، تشبیوں اور ترکیبوں کو عزیز رکھتا اور ان کے اعادہ میں ایک گونہ لطف پاتا ہے یہ تکرار اختیاری ہوتی ہے کسی بڑے سے بڑے شاعر کو بھی اس سے مفر نہیں۔ میر کے ہاں اس کی فراوانی ہے۔ غالب کا مرقع اس کی تصویر ہے۔ انیس جیسا عظیم شاعر کہ اس کے ہاں الفاظ صف بستہ کھڑے رہتے ہیں کہیں بھی اپنے چہیتے الفاظ کو نہیں چھوڑتا۔ اکبر کا معاملہ بھی ان سے مختلف نہیں۔ اختر شیرانی، ظفر علی خان اور اقبال تین مختلف راستوں کے شاعر ہیں لیکن تینوں اپنے اپنے الفاظ، اپنی اپنی ترکیبیں اور اپنے اپنے تیور رکھتے ہیں —— ظفر علی خان کے مرغوب الفاظ ساربانوں کے ساز و سامان کی طرح ساتھ رہتے ہیں۔ اقبال کے مخصوص الفاظ نہ صرف ان کے کلام کا جزوِ لاینفک ہیں بلکہ ان کی کوئی تصویر بھی ان کے بغیر مکمل نہیں ہوتی اور اختر شیرانی کے پسندیدہ الفاظ تو گل و بلبل کے عروضی لازمے کی طرح بولتے ہیں۔

گفتنی و ناگفتنی میں بھی مخصوص الفاظ کم یاب نہیں بلکہ شریانوں میں لہو کی طرح ہیں۔ مثلاً گل و لالہ، اس میں ایک خاص اٹکاؤ ہے جو بے اختیار زبانِ قلم پر آجاتا اور وادیٔ خیال کو جگمگاتا ہے —— اسی طرح فقیہہ شہر کا وجود، شرعی صورتوں کے معرکہ ہائے ناز و نیاز اور ریش ہائے سفید و سیاہ کا Symbol ہے لیکن یہ واحد متعین وجود ہے جس کی شرعی تاویلوں اور سیاسی سیہ کاریوں پر قلم نے توازن کھو دیا ہے۔ اب کوئی صاحب اس آئینے میں اپنی شکل دیکھنا چاہیں تو وہ اپنا یہ شوق بخوشی پورا کر سکتے ہیں۔ حقیقت یہی ہے کہ زیرِ نظر مجموعہ کے ہر شعر کے پیچھے کوئی نہ کوئی وجود ضرور ہے اِلّا ربعیہ کہ دماغ کی اُپج ہے۔ ان مرحوم یادوں کا پرتو جس کی تفصیل اس سے پہلے آچکی ہے۔

تقریباً دو ہی نظمیں شریک مجموعہ ہیں جو "چٹان" میں لکھی گئیں اس سے پہلے جو کچھ لکھا جہاں لکھا

کبھی محفوظ نہیں رکھا اور نہ اس کی ضرورت ہی سمجھی۔ کچھ دوستوں نے ان کے حصول میں مدد دینے کا وعدہ کیا تھا لیکن پروان نہ چڑھا۔

وہ نظمیں جن میں براہِ راست شخصی حملے تھے بالکل حذف کر دی ہیں یہاں تک کہ انھیں بیاض ہی سے پھاڑ ڈالا ہے اگر انھیں بھی شامل کیا جاتا تو مجموعہ سہ گُنا ہو جاتا لیکن گفتنی کی رونق مر جاتی اور جو باقی بچتا، وہ ناگفتنی ہوتا

یہ تمام نظمیں اپنی ابتدائی صورت میں اخباری تھیں۔ ایک ایڈیٹر کو شاذ ہی فرصت ہوتی ہے کہ وہ ادب کی فنی گہرائیوں میں ڈوبے۔ وہ لمحہ میں کہتا اور لمحہ کے لیے کہتا ہے۔ جب مجموعہ ترتیب دینا شروع کیا تو سب سے پہلے خود کو نقّاد پایا۔ کوئی نصف سے زاید اشعار کاٹ ڈالے جو باقی بچے اُن کی نوک پلک سنوارنی شروع کی۔ اس طرح باقی کا ستّر فی صد حُلیہ بھی تبدیل ہو گیا۔ اب کچھ دوستوں سے مشورہ لینا شروع کیا کہ وہ بھی نبض دیکھ لیں۔ میں اپنے مخلص دوستوں کا ممنون ہوں کہ ان کی خوش ذوقی اور خوش نظری کے باعث غور و فکر کی کچھ اور گرہیں کھُل گئیں۔

آج کل شاعری میں سب کچھ روا ہے۔ الفاظ کی ساخت تو ایک طرف رہی۔ ان کے معنی ہی بدلے جا رہے ہیں۔ پچھلے دنوں "نگار" میں ایک بہت بڑے شاعر کی انہی فیاضیوں کا جائزہ لیا گیا تھا۔ میں نے اپنی دانست میں ان کوتاہیوں سے احتراز کیا ہے اور کہیں بھی مجتہدِ فن یا مصلحِ زبان بننے کی کوشش نہیں کی جو صاحب مجھے میری غلطیوں پر ٹوکیں میں ان کا ممنون ہوں گا۔ ایک آدھ جگہ تصرّف ضرور کیا ہے۔ مثلاً پاؤں اور گاؤں کے قوافی اساتذہ کے نزدیک فعل کے وزن پر ہیں، میں نے فعلن کے وزن پر باندھا ہے۔ عام شعرا تو اسے "مستند ہے میرا فرمایا ہوا" سمجھتے ہیں لیکن میں نے محض ان کے صوتی حُسن کی خاطر یہ رعایت حاصل کی ہے ورنہ آتش کے ہاں تو اس کا جواز بھی ہے ؎

کیونکر نہ چونکے فتنہ پانوں ہیں جب تمہارے   یہ قہر جھنجھناتے سونے کے دو کڑے ہیں

زبان کے معاملے میں تشدد واقعی نا روا ہے کسی دور کے لکھنے والوں نے اسے تسلیم نہیں کیا اور آج تو زمانہ بہت آگے نکل چکا ہے۔ آخر یہ محاورہ اور روزمرہ کیا ہیں؟ ایک سماجی ذہن کی پیداوار - جب سماج بدلتا ہے تو ان میں موجود کس لیے؟ — پھر زبان کوئی ساکت و منجمد چیز نہیں۔ اس میں حرکت بھی ہے اور تغیر بھی لیکن انقلاب اور مزاج میں بڑا فرق ہے جو لوگ زبان کو چوپٹ کرنے پر تلے بیٹھے ہیں وہ انقلابی نہیں باغی ہیں اور ایسی بغاوت بہمہ وجوہ خانہ ویرانی پر منتج ہوتی ہے۔ ترقی کے معنی بڑھنا ہے توڑنا نہیں جن لوگوں کے ذہن میں ترقی کا مفہوم یہ ہو کہ مرحوم ماضی کی عمارت میں سے ہر اینٹ کھینچ لو ان کی فراست قابل اعتنا نہیں وہ خود بھی مضحک ہیں اور دوسروں کو بھی مضحک بناتے ہیں۔

اس لسانی شیفتگی کا واحد سبب اُن بڑے لوگوں کی ہم نشینی کا فیضان ہے۔ جن کے احسان میت پر تشکر سے دماغ و دل کبھی عہدہ برآ نہیں ہوئے جس شخص نے ظفر علی خان، ابوالکلام، سالک، مہر، تاجور اختر شیرانی، چراغ حسن حسرت، احسان دانش اور عطاء اللہ شاہ بخاری کی آنکھیں دیکھی ہوں۔ وہ زبان کے معاملے میں جان بوجھ کر کوئی زخم کیسے کھا سکتا ہے؟ اسی فیضان کا اقتضا تھا کہ گفتنی و ناگفتنی میں کوئی تمیز باقی نہ رہے یا کہیں کوئی شکن ہو تو نکل جائے۔ بالآخر میں تشکر و امتنان کے بوڑھے الفاظ سے اس خلوص و شفقت کو ذبح نہیں کرنا چاہتا جس کا ثبوت مجھے اس مجموعے کی ترتیب کے وقت احسان دانش سے ملا، آپ پڑھ چکے ہوں گے کہ وہ دوسری اور تیسری جماعت میں میرے استاد رہے ہیں اس منزل میں بھی ان کی نظریں وہی رہیں۔ ہمارے دلچسپ ادبی اختلاف و اتفاق سے جہاں جہاں بے توجہی کا کوئی ہلکا سا غبار تھا دُھل گیا۔

ایک بات شاید کم لوگوں کو معلوم ہو کہ "چٹان" میں آسرار بصری کے نام سے جو نظمیں لکھی گئیں یا کسی اور قلمی نام سے کوئی نظم شائع ہوئی وہ تقریباً سبھی اس مجموعہ میں شریک ہیں۔ اسرار بصری محض نام ہے جو زبان بندی کے زمانے میں اختیار کیا تھا۔

میں نہیں کہہ سکتا کہ ملک کے شعری و ادبی حلقے گفتنی و ناگفتنی کو کیونکر دیکھتے ہیں بہرحال یہ

حاضر ہیں میرے جیب و گریباں کی دھجیاں

بعض دوستوں کو مجموعہ کے نام سے اختلاف تھا وہ گفتنی و ناگفتنی کو بوجھل سمجھتے تھے لیکن بالآخر اسی پر صاد کیا۔ ظاہر ہے جو ناگفتنی ہے وہ اصلاً گفتنی ہے اور جو گفتنی تھا وہ ابھی تک ناگفتنی ہے کچھ اس وجہ سے بھی یہ نام پسند کیا گیا کہ میرا کسی ادبی دھڑے سے کوئی ادبی رشتہ نہیں۔ وہ میرے لیے موضوع ہیں ان کے لیے ۔عذار پھر سیاست میں تو جتھے بندی سمجھ میں آتی ہے ——— اور حقیقتاً جتھے بندی ہی سیاسی چیز لیکن ادب میں جتھے بندی ہر نوع اعجوبہ ہے مجھے کسی صلہ یا ستائش کی آرزو نہیں۔ بس ایک دل لخت لخت ہے۔ سو وہ بھی ——— "نذرِ دل فریبیٔ عنواں کیے ہوئے" ——— اب دیکھنا یہ ہے کہ جراحتِ دل کی پرسش کس مقام پر ہوتی اور یاروں میں سے کون کہاں بقدرِ لب و دنداں کام لیتا ہے۔ بہرحال گفتنی و ناگفتنی ——— "بوئے گل، نالۂ دل، دودِ چراغِ محفل" کا مرا عشاز ہے۔

اور یہ اوراق ——— "کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا" کی ادھوری شرح

شورش کاشمیری

فروری ۱۹۵۶ء

فہرس

غریبِ شہرِ سخن ہائے گفتنی دارد

غالبؔ

غُبارِ خاطر

خروشِ نعرۂ پیکار لے کے آیا ہُوں
حکایتِ رسن و دار لے کے آیا ہوں

دل و نظر کی متانت و فورِ غم کا سکُوت
قلم کی شوخیٔ گفتار لے کے آیا ہُوں

غمِ حیات، غمِ آرزو، غمِ ملّت!
تمام عُمر کے افکار لے کے آیا ہُوں

مرے قلم میں ادیبوں کی آب و تاب کہاں
متاعِ دیدۂ خونبار لے کے آیا ہُوں

نیا چمن، نئی شاخیں، نئے گلاب و سمن
نئی بہار کی اقدار لے کے آیا ہُوں

حیات و موت کی سنگین شاہراہوں میں
غرورِ جادۂ ایثار لے کے آیا ہُوں

"گریزد از صفِ ما ہر کہ مردِ غوغا نیست
کسے کہ کُشتہ نہ شُد از قبیلۂ ما نیست"

ہزار بار زمانے کے سرد طاقوں پر

چراغ خونِ جگر سے جلائے ہیں مَیں نے

دیا ہے وقت کے چہرے کو اذنِ رعنائی

سیاسیات کے ایواں سجائے ہیں مَیں نے

کیا ہے نظم عزیزوں کی سرد مہری کو

کچھ ان کہے بھی فسانے سُنائے ہیں مَیں نے

بہت قریب سے دیکھا ہے رہنماؤں کو

بہت قریب سے کچھ راز پائے ہیں مَیں نے

کہوں تو گردشِ لیل و نہار رُک جائے

وہ راز، جن سے بہت غم اُٹھائے ہیں مَیں نے

فقیہِ شہر کی آلودہ دامنی کی قسم!

نقابِ خانقہی بھی اُٹھائے ہیں مَیں نے

"مپُرس تا چہ نوشت است کلکِ قاصرِ ما

خطِ غبارِ من است ایں غبارِ خاطرِ ما"

انقلاب اے انقلاب

چراغِ لالہ بہ عنوانِ داستاں نہ رہا
کہ جس کے ہم تھے عنادل وہ گلستاں نہ رہا
بہار آئی تو شاخوں پہ کونپلیں نہ پلیں!
سحر ہوئی تو گل و لالہ کا نشاں نہ رہا
صبا کی چال میں پہلی سی دل کشی نہ رہی
ہوا کی موج کا اندازِ گل فشاں نہ رہا
زباں نے جُراَتِ اظہار کی سزا پائی
قلم میں ولولۂ تیغِ اصفہاں نہ رہا
ستم کہ "دُخترِ مینا" کا دَور بیت گیا
غضب کہ ساقیِ گل فام مہرباں نہ رہا
ہزار شُکر ملی، رہزنوں سے راہِ نجات
ہزار حیف کوئی میرِ کارواں نہ رہا
نوائے شوق زبانوں پہ آکے رُکتی ہے
کہیں تو کس سے کہیں، کوئی رازداں نہ رہا

ہم کیا ہیں؟

اس گلستاں میں نعرہ زنِ نو بہار ہیں
ہم کیا ہیں انقلابِ نوی کی پکار ہیں

ممنونِ التفاتِ صبا ہیں سرِ چمن!
مدحت گذارِ گردشِ لیل و نہار ہیں

بے فکر بڑھ رہے ہیں حریمِ وفا کی سمت
ہم مے گسارِ میکدۂ روزگار ہیں

دلچسپ حادثوں سے مزیّن ہیں روز و شب
ہم صاحبِ امانتِ لیل و نہار ہیں

اُلجھیں تو کائنات کے سینے میں ہو شگاف
یلغار ہو تو لشکرِ میداں شکار ہیں

اُٹھیں تو مہر و ماہ کے جلوے ہوں ہم رکاب
پھیلیں تو ہر روش پہ گلوں کا نکھار ہیں

ہم ہیں حرم فروش فقیہوں کے نکتہ چیں
ہم ہیں فقیرِ راہ، مگر شہر یار ہیں

معیار

میرے سرمایۂ افکار تک آ پہنچے ہیں
شحنۂ شہرِ دلِ زار تک آ پہنچے ہیں

رہنما خنجرِ قاتل کے تماشائی ہیں
راہ روِ منزلِ ایثار تک آ پہنچے ہیں

چہرۂ شب کی سیاہی سے پتہ چلتا ہے
لوگ ہنگامۂ پیکار تک آ پہنچے ہیں

شعلہ سامانیٔ جمہور بڑی نعمت ہے
بے نوا دامنِ زردار تک آ پہنچے ہیں

خوشہ چینانِ سیاست کو خبر ہے کہ نہیں
ہم مسافر رسن و دار تک آ پہنچے ہیں

خان زادوں کے گرڑے ہاتھ" خدا خیر کرے
چاک دامانیٔ احرار تک آ پہنچے ہیں

وائے بر حالِ سخن، حیف بہ عنوانِ سخن
"بوالہوس بھی مرے معیار تک آ پہنچے ہیں"

مُستقبل

یہ دورِ تیرہ و تاریک بیت جائے گا — کبھی تو مہرِ جہاں تاب مسکرائے گا
اُفق کی سُرخ قبا سے سُراغ ملتا ہے — ہمارا خون ستاروں میں جگمگائے گا
عوام دامنِ صد چاک لے کے نکلیں گے — چراغِ قصرِ خوانین جھلملائے گا
اُٹھیں گے ہاتھ مہ و مہر کی قباؤں پر — غرورِ جُبّہ و دستار ٹوٹ جائے گا
زبانِ تیغ پُکارے گی رہنماؤں کو — زمانہ سحر بھرے گیت گنگنائے گا
ہمارے بعد کہاں یہ وفا کے ہنگامے — کوئی کہاں سے ہمارا جواب لائے گا

وزارتیں تو کھلونے ہیں ٹوٹ جائیں گے
"چٹان"° آئے گا آخر ضرور آئے گا

° یہ نظم اس دَور کی یادگار ہے جب دولتانہ وزارت نے ایک سال کے لیے چٹان کا گلا گھونٹ دیا تھا۔

جان پہچان

تم کو بہت قریب سے پہچانتا ہوں میں
پیرانِ خانقاہ ہو تم جانتا ہوں میں

میرے حضور اپنے مشاغل تو دیکھئے
میں ہوں گناہگار یہ خود مانتا ہوں میں

آغازِ انقلابِ چمن ہے قریب تر
انجامِ اضطرابِ چمن جانتا ہوں میں

سرو و سمن ہیں خطرۂ گل چیں سے بے نیاز
صرصر کے پیچ و تاب کو پہچانتا ہوں میں

تقسیمِ گلستاں سے دلِ برگ و بار پر
جو کچھ گذر گئی ہے اُسے جانتا ہوں میں

ریشِ دراز پر ہے حیا کے لہو کی آب
شورشِ فقیہِ شہر کو پہچانتا ہوں میں

سوال

حرمِ فردوس فقیہوں میں آگہی نہ شعور
قدم قدم پہ رعونت، نفس نفس میں غرور
اک اضطرابِ مسلسل، غیاب ہو کہ حضور

دل و نظر کے ارادے بدلتے جاتے ہیں
حیات و موت کے جادے بدلتے جاتے ہیں
یہ پیرہن، یہ لبادے بدلتے جاتے ہیں

ہزار بار بسے، صد ہزار بار لٹے
خزاں کی دست درازی سے لالہ زار لٹے
قریبِ منزلِ مقصود شہ سوار لٹے

اُبھر اُبھر کے کئی آفتاب ڈوب گئے
نکھر نکھر کے کئی ماہتاب ڈوب گئے
لہو چھڑک کے کئی انقلاب ڈوب گئے

ہر ایک موڑ پہ اُلجھے ہُوئے خیال بہت
اگر نظر ہو تو فطرت کے خط و خال بہت
بہر سکُوت کھٹکتے ہوئے سوال بہت

فغاں، کہ اہلِ چمن کو شکایتیں ہی رہیں
ستم، کہ نامِ خدا پر روایتیں ہی رہیں
غضب کہ مہر و وفا کی حکایتیں ہی رہیں

حیات و موت کا عنواں الم طراز رہا
یہ ہے وہ راز جو روزِ ازل سے راز رہا
خدا تو تھا ہی زمانہ بھی بے نیاز رہا

○

اقدام

مجاہدوں کی حمیّت کے پاسدار ہو تم
خدا کا شکر ہے ٹیپو کی یادگار ہو تم
اُٹھو کہ گنگ و جمن سے گھٹائیں اٹھّی ہیں
بڑھو کہ باغ و چمن کے لیے بہار ہو تم
چلو کہ گردشِ حالات رُک ہی جائے گی
قدم اُٹھاؤ کہ تقدیرِ روزگار ہو تم
قضا سے آنکھ ملاؤ کہ وقت نازک ہے
بزن، کہ خندۂ شمشیرِ آبدار ہو تم
قدم بڑھاؤ کہ روشن ہوں منزلوں کے چراغ
سناؤ گیت کہ آوازِ کارزار ہو تم
لگاؤ ضرب زمانے کی بے ثباتی پر
اٹھاؤ تیغ کہ معمارِ نو بہار ہو تم
ہو سر بلند، زمانہ اُبھارتا ہے تمھیں
حریف بر سرِ میداں پکارتا ہے تمھیں

تحریک

جانِ عشّاق بہ عنوانِ وفا حاضر ہے
ضربِ شمشیر بہ میدانِ وغا حاضر ہے
تیز رَو صُورتِ خورشید اُبھر آئے ہیں
قوتِ بازوئے مردانِ خدا حاضر ہے
کہکشاں جلوہ فشاں ہے کہ مجاہد اُٹھے
ماہ و خورشید کی زرکار قبا حاضر ہے
لشکرِ ملّتِ بیضا نے عَلم کھولے ہیں
ضربتِ تیغ بصد ناز و ادا حاضر ہے
آج پھر نقش حسینؓ ابن علیؓ اُبھرے ہیں
آج پھر شیوۂ تسلیم و رضا حاضر ہے
پھُول لہرائے کہ پھر فصلِ بہار آ پہنچی
کونپلیں خوش ہیں کہ دامانِ صبا حاضر ہے
عسکری بازوئے حیدرؓ کی قسم کھاتے ہیں
جانبِ منزلِ مقصُود بڑھے جاتے ہیں

آزمائش

جلالِ پنجۂ مرحب فگن کی آزمائش ہے
کمالِ قوتِ خیبر شکن کی آزمائش ہے

اِدھر شیخِ حرم کی عافیت میں رند آپہنچے
اُدھر نورِ نگاہِ برہمن کی آزمائش ہے

اِدھر کف در دہاں ہیں کوثر و تسنیم کی موجیں
اُدھر طغیانیِ گنگ و جمن کی آزمائش ہے

صف آرا غازیوں کی ضربتِ کاری کا وقت آیا
کفن بر دوش احرارِ وطن کی آزمائش ہے

گل و لالہ کے پیرائے میں ہے ایثار کی دعوت
صبا کے روپ میں اہلِ چمن کی آزمائش ہے

فضا میں تیرتے ہیں نعرہ ہائے شعلہ و شبنم
بہر سُو خاطرِ سرو و سمن کی آزمائش ہے

"قد و گیسو میں قیس و کوہکن کی آزمائش ہے
جہاں ہم ہیں وہاں دار و رسن کی آزمائش ہے" غالب

آغازِ خوش انجام

آج پھر ملّتِ بیضا کے علم اُٹھّے ہیں
آج پھر ایبک و بابر کے قدم اُٹھّے ہیں

آج بھڑکے ہیں دلِ شیخِ حرم میں شُعلے
آج کعبہ سے اُلجھنے کو صنم اُٹھّے ہیں

آج پھر ضربتِ کاری کا محل آپہنچا
آج پھر بادیہ پیمائے عجم اُٹھّے ہیں

آج مچلے ہیں کسی بات پہ رندانِ عجم
آج پھر نغمہ سرایانِ حرم اُٹھّے ہیں

آج بجلی سے بھی کچھ تیز ہے آوازِ خطیب
آج شمشیر کے مانند قلم اُٹھّے ہیں

خاکِ لاہور سے خیبر کی گذرگاہوں تک
شہ سوارانِ حجازی کے علم اُٹھّے ہیں

آج سے کُفر پہ فرمانِ قضا نافذ ہے
اب ہمارا ہے یہ اعلان کہ ہم اُٹھّے ہیں

مشغلہ

حدودِ سرو و سمن میں صبا سے کھیلا ہوں
بہت دنوں تری زلفِ رسا سے کھیلا ہوں

سکوں تلاش کیا ہے دراز زلفوں میں
بُتانِ شُعلہ بدن کی ادا سے کھیلا ہوں

اُٹھا ہوں حُسنِ معانی کا رنگ و بوئے کر
سخنوروں کے فسونِ نوا سے کھیلا ہوں

مرے قلم نے مذاقِ حیات بدلا ہے!
بلندیوں پہ اُڑا ہوں، سما سے کھیلا ہوں

بڑے بڑوں کی فضیلت کے بل نکالے ہیں
درازدستیِ پیکِ قضا سے کھیلا ہوں

رہا ہوں قیدِ مشقّت میں دس برس شورشؔ
ہر ایک حلقۂ زنجیرِ پا سے کھیلا ہوں

ہم

دار و رسن کی گود کے پالے ہوئے ہیں ہم
سانچے میں مشکلات کے ڈھالے ہوئے ہیں ہم

وہ دولتِ جنوں کہ زمانے سے اُٹھ گئی
اُس دولتِ جنوں کو سنبھالے ہوئے ہیں ہم

فردوس کاشمیر ابھی تک نظر میں ہے
ہر چند اب وہاں سے نکالے ہوئے ہیں ہم

اپنے سروں کو نوکِ سناں پر بہ کرّ و فر
پُرہول معرکوں میں اُچھالے ہوئے ہیں ہم

روکے ہوئے ہیں سیلِ بلا کی روانیاں
ہر نوجواں کا غیظ سنبھالے ہوئے ہیں ہم

رجعت میں فرد ہیں تو دنائت میں بے مثال
اب ایسے رہزنوں کے حوالے ہوئے ہیں ہم

سنگِ میل

غنچے بھی مضمحل ہیں، صبا بھی علیل ہے
یہ دورِ انقلابِ چمن کی دلیل ہے

رندانِ میکدہ کی عبائیں ہیں چاک چاک
مینا خراب حال ہے، ساقی ذلیل ہے

ہیں ہمرہانِ سست عناصر شکستہ گام
میرانِ کارواں کی فراست قلیل ہے

حجروں میں ہنس رہے ہیں پُرانے حرم فروش
اربابِ انتظام کی غیرت علیل ہے

انساں پہ حکمراں ہیں ہلاکو کے جانشیں
قدرت کے احتسابِ خصوصی میں ڈھیل ہے

اُسلوبِ شاعری میں بعنوانِ اجتہاد
اقبالؔ کی زبانِ غزل سنگِ میل ہے

شورشؔ فقیہہِ شہر کے چہرے کی آب و تاب
قرآں کی آیتوں کے لہو کی دلیل ہے

بیچتا پھرتا ہوں میں!

حاصلِ عمرِ پریشاں بیچتا پھرتا ہوں میں
اپنا اندازِ گریباں بیچتا پھرتا ہوں میں

سُرمئی راتوں سے چھنوا کر سحر کی رونقیں
نالۂ شامِ غریباں بیچتا پھرتا ہوں میں

مُطربِ شعلہ بدن کی مہ وشی کے نام پر
طلعتِ صبحِ درخشاں بیچتا پھرتا ہوں میں

موجِ بربط، موجِ گُل، موجِ صبا کے ساتھ ساتھ
نکہتِ گیسوئے خوباں بیچتا پھرتا ہوں میں

وائے بر حالِ عزیزاں، ہائے خوئے دوستاں
در بدر خونِ رگِ جاں بیچتا پھرتا ہوں میں

دیدنی ہے اب مرے چاکِ گریباں کی بہار
کج کلاہوں کے گریباں بیچتا پھرتا ہوں میں

شعلۂ تاریخ کی زد پر ہے تاجِ خسروی
غرّہ تقدیرِ سُلطاں بیچتا پھرتا ہوں میں

کلبۂ محنت کشاں کو دے کے غیرت کے چراغ
شوکتِ قصرِ زر افشاں بیچتا پھرتا ہوں میں

دولتِ غم کے خریدارو! صلائے عام ہے
تلخیٔ قلبِ پریشاں بیچتا پھرتا ہوں میں!

نئے دَور کا فرمان

دیکھ کونین کا جی ڈوب رہا ہے ساقی
شاخساروں سے لہو رِستا ہے
خونِ احرار سفیہوں کو روا ہے ساقی
مرغزاروں سے لہو رِستا ہے

دُور ساحل سے بہت دُور اُفق سے بھی پرے
ناؤ غرقاب ہوئی جاتی ہے
ان گھٹا ٹوپ اندھیروں میں شفق سے بھی پرے
موج گرداب ہوئی جاتی ہے

آج تک گردشِ حالات کی سنگینی پر
رُوحِ کونین بھڑکتی ہی رہی

سُرمئی شب میں جھلکتی ہُوئی رنگینی پر
نبضِ ایّام دھڑکتی ہی رہی

باغباں رسمِ گلستان کو بدلتے ہی رہے
ہائے افسوس! عزیزانِ چمن
رہنما جادۂ منزل سے بھٹکتے ہی رہے
آہ! اے سفلگیٔ چرخِ کہن

اہلِ محنت کا لہو بادۂ گُل فام بنا
جگمگاتے ہُوئے پیمانوں میں
نالۂ دردکشاں، خندۂ صمصام بنا
جھلملاتے ہُوئے ایوانوں میں

وقت کے ساتھ بدلتے ہُوئے دھارے کی صدا
جنگِ جمہور کا عنوان بنی

ٹوٹتی شب کے سحر تاب ستارے کی صدا
اک نئے دَور کا عنواں بنی

ٹمٹماتے رہے پُرپیچ عقیدوں کے چراغ
انقلابات کے میدانوں میں
اور کہیں مل نہ سکا شاہدِ فطرت کا سُراغ
عقلِ انساں کے صنم خانوں میں

کُچھ دنوں اور اندھیرے کی فراوانی ہے
طلعتِ صبحِ درخشاں کی قسم
کچھ دنوں اور غریبوں پہ ستم رانی ہے
کجکلاہوں کے گریباں کی قسم

آخر اک روز یہ دولت کا فسوں ٹوٹے گا
رنگ محلوں کے دریچوں سے لہو پھُوٹے گا

سیاست

ہم نے اس وقت سیاست میں قدم رکھّا تھا
جب سیاست کا صلہ آہنی زنجیریں تھیں
سرفروشوں کے لیے دار و رسن قائم تھے
خان زادوں کے لیے مفت کی جاگیریں تھیں
بے گناہوں کا لہو عام تھا بازاروں میں
خونِ احرار میں ڈوبی ہوئی شمشیریں تھیں
از اُفق تا بہ اُفق خوف کا سنّاٹا تھا
رات کی قید میں خورشید کی تنویریں تھیں
رہنماؤں کے لیے حکمِ زباں بندی تھا
جُرمِ بے جُرم کی پاداش میں تعزیریں تھیں
جانشینانِ کلایو تھے خداوندِ مجاز
سرِّ توحید کی برطانوی تفسیریں تھیں
حیف اب وقت کے غدّار بھی رستم ٹھہرے
اور زنداں کے سزاوار فقط ہم ٹھہرے

رفت وگزشت

خوب جی بھر کے عزیزانِ چمن دیکھ چکے
نکہتِ سُنبل و ریحاں کا پریشاں ہونا
شوخیِ زہرہ جبیناں کا لہو میں ڈھلنا
سرخیِ خونِ شہیداں کا نمایاں ہونا
خان زادوں کا رعونت سے اکڑ کر چلنا
بے نواؤں کا سراسیمہ و حیراں ہونا
وقت پڑنے پہ قباؤں کا بھرم کُھل جانا
رہنماؤں کے خط و خال کا عُریاں ہونا
برقِ تثلیث کا توحید کے سر پر گرنا
خانہ ویرانیِ اسلام کا ساماں ہونا

قیدِ بے جرم کی زنداں میں دُہائی مچنا
کفر کے ہاتھ میں ایماں کا گریباں ہونا

خاک کا منبر و محراب کی چادر بننا
خون میں جبہ و دستار کا غلطاں ہونا

روز و شب خنجرِ قاتل کی ستائش لکھنا
روز و شب عصمتِ خامہ کا پریشاں ہونا

"کی مرے قتل کے بعد اُس نے جفا سے توبہ
ہائے اُس زُود پشیماں کا پشیماں ہونا"

سوچ

خدایا یہاں کے خداؤں کا حشر کیا ہوگا؟
مرے وطن کی فضاؤں کا حشر کیا ہوگا؟
"جو بادہ خوار پرانے تھے اُٹھتے جاتے ہیں"
سبُو بدوش گھٹاؤں کا حشر کیا ہوگا؟
ادیب بیچ رہے ہیں متاعِ دیدہ و دل
سخنوروں کی نواؤں کا حشر کیا ہوگا؟
ستم رسیدہ وفاؤں کا حال دیکھ لیا
فریب خوردہ حیاؤں کا حشر کیا ہوگا؟
اُلجھ رہا ہے خدائی سے مُلحدوں کا جلال
حرم فروش قباؤں کا حشر کیا ہوگا؟

سرود و چنگ میں ہے آہِ نیم شب کا گداز
مُغنّیوں کی نواؤں کا حشر کیا ہوگا؟

جھلک رہے ہیں جبینوں سے سجدہ ہائے ریا
بلند بانگ دعاؤں کا حشر کیا ہوگا؟

جفا تو خیر ترا شیوۂ سخن ٹھہرا؟
مری عزیز وفاؤں کا حشر کیا ہوگا؟

مری فغاں پہ ابھی تک ہے محتسب کی نظر
مرے قلم کی صداؤں کا حشر کیا ہوگا؟

دُعائے نیم شبی

زورِ بیان و قوّتِ اظہار چھین لے
مُجھ سے مرے خُدا، مرے افکار چھین لے

کچھ بجلیاں اُتار قضا کے لباس میں
تاج و کُلاہ و جُبّہ و دستار چھین لے

عفّت کے تاجروں کی دکانوں کو غرق کر
نظّارہ ہائے گیسو و رُخسار چھین لے

شاہوں کو ان کے غزّۂ بے جا کی دے سزا
محلوں سے اُن کی رفعتِ کُہسار چھین لے

میں اور پڑھوں قصیدۂ اربابِ اقتدار
میرے قلم سے جرأتِ رفتار چھین لے

میری فغاں سے قصرِ شہی میں کُھلیں دراڑ
میری زباں سے رنگِ گُہربار چھین لے

اربابِ اختیار کی جاگیر ضبط کر
یا غم زدوں سے نعرۂ پیکار چھین لے

آج بھی ہے

حق پسندوں سے زمانے کی دغا آج بھی ہے
تیرے بندوں پہ ستم میرے خدا! آج بھی ہے

پا بجولاں ہیں غلط کارِ سیاست کے حریف
بامِ زنداں پہ سلاسل کی صدا آج بھی ہے

ختم ہے دعوت ارشاد کی شمشیر کا لوچ
لالہ گوں صُوفی و مُلّا کی قبا آج بھی ہے

آلِ مروان بدستور ہے اورنگ نشیں
ہند میں معرکۂ کرب و بلا آج بھی ہے

زرپرستوں کو ہے انکار، تو انکار کریں
میرا ایماں ہے غریبوں کا خدا آج بھی ہے!!

سنہ ۱۹۵۲ء

یہ سال اعتبارِ صبا ساتھ لے گیا
صد حیف رسم و راہِ وفا ساتھ لے گیا

مستوں کی بات دار و رسن تک پہنچ گئی
رندوں کے نعرۂ ہائے دعا ساتھ لے گیا

کچھ رہزنوں کے دل میں اتارا خدا کا خوف
کچھ حاکموں کا خوفِ خدا ساتھ لے گیا

گویا زباں سے چھین کے آزادیٔ بیان
میرے قلم کی تلخ نوا ساتھ لے گیا

نظارہ ہائے گیسو و رخسار عام ہیں
زہرہ وشوں کی شرم و حیا ساتھ لے گیا

بے لوث دشمنوں کے نقابات اُٹھ گئے
بے مہر دوستوں کی ریا ساتھ لے گیا
یاروں کی چھیڑ چھاڑ، عزیزوں کی دُھوم دھام
یہ سال اس طرح سے گیا ساتھ لے گیا

---

۵ - اس سال دولتانہ وزارت نے چٹان کو ایک سال کے لیے بند کر دیا تھا۔

ذرا صبر!

اک نئے دَور کی ترتیب کے ساماں ہوں گے
دستِ جمہور میں شاہوں کے گریباں ہوں گے
برق خود اپنی تجلّی کی محافظ ہو گی!
پھول خود اپنی لطافت کے نگہباں ہوں گے
نغمہ و شعر کا سیلاب اُمڈ آئے گا!
وقت کے سحر سے غنچے بھی غزلخواں ہوں گے
ناؤ منجدھار سے بے خوف و خطر کھیلے گی!
ناخدا بربطِ طوفاں پہ رجز خواں ہوں گے
راہ رو اپنی مسافت کا صلہ مانگیں گے
رہنما اپنی سیاست پہ پشیماں ہوں گے
راست گفتار کہ ہیں ناقدِ اولادِ فرنگ
وقت کہتا ہے کہ پھر داخلِ زنداں ہوں گے
تو کہاں جائے گی کچھ اپنا ٹھکانا کر لے
"ہم تو کل خوابِ عدم میں شبِ ہجراں ہوں گے"

مشورہ

داماں کو تار تار اگر کر سکے تو کر

یہ جبر اختیار اگر کر سکے تو کر

سُورج کو آسماں کی بلندی سے کھینچ لا

ذرّوں کو کوہسار اگر کر سکے تو کر

خونِ رگِ چمن سے اُٹھا حشرِ اضطراب

فطرت کو اشکبار اگر کر سکے تو کر

محنت کشوں سے مانگ نواہائے رستخیز

شاہوں کو زیبِ دار اگر کر سکے تو کر

حفظِ خودی پہ نظمِ جہاں کا مدار ہے

یہ راز آشکار اگر کر سکے تو کر

بیدار کر ضمیر کو بیباک کر عمل

یہ عہد استوار اگر کر سکے تو کر

ہمارا جوابؒ پیدا کر

ہر حال میں ہر دَور میں تابندہ رہوں گا
میں زندۂ جاوید ہوں پایندہ رہوں گا

تہذیبِ خطابت ہو کہ تہذیبِ صحافت
ان دونوں محاسن کا نمایندہ رہوں گا

اُبھروں گا سراپردۂ آفاق سے بے رُوک
خورشید جہاں تاب ہوں رخشندہ رہوں گا

تاریخ مرے نام کی تعظیم کرے گی
تاریخ کے اوراق میں آیندہ رہوں گا

احرار سمجھتے ہیں مری بات کو شورشؔ
ناموسِ محمدؐ کی قسم، زندہ رہوں گا

عہد

صبا کے روپ میں ہر سمت پھیل جاؤں گا
مرے وطن تری عظمت کے گیت گاؤں گا
لٹاؤں گا تری راہوں پہ خندہ ہائے سحر!
ترے لیے مہ و خورشید خود بناؤں گا
بچھاؤں گا ترے ذرّوں پہ فرشِ لالہ و گُل
ترے اُفق کے ستاروں میں مسکراؤں گا
تری طلب پہ مرے لختِ دل بھی حاضر ہیں
انہیں سے میں ترے دیوار و در سجاؤں گا
اگر تصرّفِ گُل چیں رہا بہاروں پر
تو پھر میں اُن کا لہو تک نچوڑ لاؤں گا

قصاص لوں گا شہیدوں کے خونِ ناحق کا
یزیدیوں کے مقابر پہ مُسکراؤں گا
خدا نے شعلہ نوائی مجھے عطا کی ہے
عوام سوئے ہوئے ہیں انھیں جگاؤں گا
مرا قلم مرے جمہور کی امانت ہے
میں اپنے فرض کو ہر حال میں نبھاؤں گا
غنیم نے کبھی ٹوکا تو پھر خدا کی قسم
قلم کو توڑ کے تلوار لے کے آؤں گا

صحافی

اُٹھاؤ تیغِ ستم اور مسکراتے رہو
ہمارے حال پہ یوں بجلیاں گراتے رہو
جبیں جھکاؤ، فضیلت مآب آتے ہیں
وزارتوں کی خوشامد کے گیت گاتے رہو
قلم بدست رفیقو! تمھیں اجازت ہے
متاعِ علم و ہُنر بیچ بیچ کھاتے رہو
بڑھاؤ اپنی اشاعت کہ وقت نازک ہے
حرم فروش فقیہوں کو آزماتے رہو
بلالؓ و بوذرؓ و سلماںؓ کا دَور بیت گیا
بلالؓ و بوذرؓ و سلماںؓ کے راگ گاتے رہو
ہر ایک پیر کو سمجھو خدائے کون و مکاں
ہر اک وزیر کی چوکھٹ پہ سر جھکاتے رہو
یہ بات آج خلافِ مفاد پڑتی ہے
کہ خونِ دل سے چراغِ وفا جلاتے رہو

کچھ دنوں بعد

عام ہے قاتل و مقتول کی رُوداد ابھی
خُون روتے ہیں کئی خانماں برباد ابھی
دامنِ شب سے جھلکتا ہے ستاروں کا لہو
کھیلتی ہے لبِ خورشید پہ فریاد ابھی
بادِ صرصر سے ہے مجروح شگوفوں کا دماغ
گھات میں بُلبل و قمری کی ہے صیّاد ابھی
عصمتِ زہرہ وشاں جنس ہے بازاروں کی
نقدِ ایماں کے خریدار ہیں شدّاد ابھی
خونِ احرار سے لبریز ہیں مینا و ایاغ
شہ رگِ عدل پہ ہے خنجرِ جلّاد ابھی
بر سرِ اَوج ہیں ہامانِ کے فرزندِ جدید
بر سرِ کار ہے نمرود کی اُولاد ابھی
تا بکے؟ ان کے اداروں کا فسُوں ٹوٹے گا
خان زادوں کی جبینوں سے لہو پھُوٹے گا

انتباہ

ابھی — اک نیا گیت گانا پڑے گا
ابھی — وقت کو آزمانا پڑے گا

ابھی — زورِ بازو دکھانا پڑے گا

ابھی — اس چمن میں لٹیرے ہیں باقی
ابھی — اس فضا میں اندھیرے ہیں باقی

ابھی — مہر و مہ کو بلانا پڑے گا

ابھی — کونپلوں کی فضا لالہ گوں ہے
ابھی — دامنِ شب پہ تاروں کا خوں ہے

ابھی — قصرِ ظلمات ڈھانا پڑے گا

ابھی — گیسوؤں پر شکن پڑ رہے ہیں
ابھی — یاسمینی بدن بک رہے ہیں

ابھی کچھ دنوں تلملانا پڑے گا

ابھی — گیسوؤں کی ادا مضمحل ہے
ابھی — عارضوں پر حیا مضمحل ہے

ابھی — ظالموں کو مٹانا پڑے گا

منادی

ہر اک شاخِ چمن نخچیر ہو گی
فضا نعرہ زنِ تکبیر ہو گی
حضوری باغ میں تقریر ہو گی
منادی ہو رہی ہے ——

زبانوں پر خدا کا نام ہو گا
دلوں میں جلوۂ اصنام ہو گا
شہیدوں کا لہو نیلام ہو گا
منادی ہو رہی ہے ——

خطابت سر بزانو ہو چکی ہے
حمیّت حاکموں کو رو چکی ہے
متاعِ علم و دانش کھو چکی ہے
منادی ہو رہی ہے ——

کہاں تک سسکیاں بھرتے رہوگے ۔۔۔ قضا کے خوف سے ڈرتے رہوگے
کہاں تک جیتے جی مرتے رہوگے

— منادی ہو رہی ہے

گلاب و سرو و ریحاں بک رہے ہیں ۔۔۔ قبیلوں کے گریباں بک رہے ہیں
ارے تو یہ مسلماں بک رہے ہیں

— منادی ہو رہی ہے

حرفِ مکرّر

گو اپنے دوستوں کے برابر نہیں ہوں میں
لیکن کسی حریف سے کمتر نہیں ہوں میں

لرزاں ہیں میرے نام کی ہیبت سے کاسہ لیس
اربابِ اقتدار کا نوکر نہیں ہوں میں

مجھ کو رہا ہے فنِّ خوشامد سے احتراز
کہتا ہوں سچ کہ جھوٹ کا خوگر نہیں ہوں میں

ضربِ خودی ہوں تاجِ شہی کے غرور پر
حلقہ بگوشِ سنجر و قیصر نہیں ہوں میں

ہوں خوشہ چینِ غالبؔ اقبالؔ و بوالکلام
آگاہ ہوں کہ ان کے برابر نہیں ہوں میں

"یا رب زمانہ مجھ کو مٹاتا ہے کس لیے؟
لوحِ جہاں پہ حرفِ مکرّر نہیں ہوں میں"

پایا ہے رہبروں کی سیاست کو بے نقاب
شورشؔ خدا کا شکر ہے رہبر نہیں ہوں میں

اعلان

عوام سوئے ہوئے ہیں اُنھیں جگاؤں گا
کلاہِ قیصر و کسریٰ پہ مُسکراؤں گا

اس ارضِ پاک کے جمہور کی ضرورت پر
قلم کے زعم پہ تلوار لے کے آؤں گا

بناؤں گا میں ستاروں کو ہم رکاب اپنا
اُفق سے مہرِ جہاں تاب کھینچ لاؤں گا

ابھی کچھ اور مجھے اس چمن میں رہنے دو
ابھی کچھ اور محبت کے گیت گاؤں گا

ابھی تو سایۂ زلفِ دراز بہتر ہے
ابھی تو شعر کی وادی میں گنگناؤں گا

مگر یقین کرو، جب مجھے پکارو گے
تو اے عزیز رفیقو! ضرور آؤں گا

جُرم

اس چمن میں رنگ و بُو سے آشنائی جُرم ہے
ہمنوائی عیب ہے، نغمہ سرائی جُرم ہے

میکدے پر ہے بُتانِ سیم و زر کو اختیار
بزمِ ساقی تک غریبوں کی رسائی جُرم ہے

کارواں گُم کردہ منزل، راستے پُر پیچ و خم
رہروانِ خستہ پا کی رہنمائی جُرم ہے

میکدے کی چار دیواری سے تا حدِّ حرم
صُوفی و مُلّا کا زعمِ پارسائی جُرم ہے

اُس طرف فرماں روا ہیں کاسہ لیسانِ فرنگ
اِس طرف دار و رسن سے آشنائی جُرم ہے

انقلاباتِ زمانہ کے مظالم دیکھئے!
آج کل اس ملک میں شعلہ نوائی جُرم ہے

یہ ہے میرے بست سالہ تجربے کا ماحصل!
مفلسی ہر حال میں اک انتہائی جُرم ہے

احساسِ تنہائی

عروسانِ چمن کی بے سروسامانی نہیں جاتی
گلاب و سنبل و ریحاں کی حیرانی نہیں جاتی

ابھی تک شہ رگِ محنت ہے استعمار کی زد میں
ابھی تک انقلابِ نَو کی ویرانی نہیں جاتی

بڑی خونخوار ہے سرمایہ و محنت کی آویزش
خداوندانِ سیم و زر کی نادانی نہیں جاتی

یہ مصرع ثبت ہے تاریخ کے چاکِ گریباں پر
"کُلاہِ خسروی سے بُوئے سُلطانی نہیں جاتی"

فقیہوں کی بدولت ایک ایسا وقت آتا ہے
خدا کے نام پر جب بات تک مانی نہیں جاتی

اب اپنا ملک ہے بالکل بجا، میرے خداوندو!!

مگر جمہور کے چہرے کی حیرانی نہیں جاتی

کلاہیں کج کیے پھرتے ہیں اربابِ صنم خانہ

کنیزانِ حرم کی چاک دامانی نہیں جاتی

تمھاری باندیاں انبار ریشم کے نگلتی ہیں

ہماری بیٹیوں کے تن کی عُریانی نہیں جاتی

کچھ ایسا قیدِ تنہائی میں لاغر ہو گیا شورشؔ

کہ اب صورت بھی بے چارے کی پہچانی نہیں جاتی

فرار

باغی خنجر تول رہے ہیں   خونی پرچم کھول رہے ہیں
سنگھاسن سب ڈول رہے ہیں   موت کی بانی بول رہے ہیں

ختم ہوا گھنگھور اندھیرا   زرداروں کو موت نے گھیرا
محنت نے غم سے مُنہ پھیرا   بھاگ گیا ہر ایک لُٹیرا

محلوں کی سرداری رخصت   شاہوں کی مختاری رخصت
محنت کی ناداری رخصت   رسم و رہِ غدّاری رخصت

دوڑو وقت کا دھارا موڑو   غدّاروں کا خون نچوڑو
موت سے ان کا رشتہ جوڑو   ان کے دل میں خنجر توڑو

جان لڑانے والے اُٹھے — تیغیں اُٹھیں، بھالے اُٹھے
آہیں اُٹھیں نالے اُٹھے — دھرتی کے رکھوالے اُٹھے

وقت کے خط و خال سے خطرہ — گردشِ ماہ و سال سے خطرہ
بھارت کو نیپال سے خطرہ — مستقبل کو حال سے خطرہ
باغی خنجر تول رہے ہیں

٭ ہز میجسٹی مہاراج ادھیراج تری بھون بیر بکرم شاہ دیو نیپال سے بھاگ جانے کی خبر سُن کر

متاعِ گُم شُدہ

اس سرزمیں سے مہر و وفا کون لے گیا
اَوجِ کمال و بختِ رسا کون لے گیا

زُلفِ بہار دوشِ خزاں پر بکھر گئی
سرو و سمن کی آب و ہوا کون لے گیا

غنچے خموش ، پھُول پریشاں ، فضا اُداس
لُطفِ خرامِ بادِ صبا کون لے گیا

آنکھوں کو پاسِ شرعِ پیمبر نہیں رہا
چہروں سے آب و تابِ حیا کون لے گیا

نقش و نگارِ چہرۂ اسلاف مٹ گئے
وہ استوارِ عہدِ وفا کون لے گیا

انصاف بک رہا ہے زر و سیم کے عوض
اِن حاکموں سے خوفِ خدا کون لے گیا

اندوہ گیں ہے انجمنِ نَو بہارِ شعر
شورش مرے سخن کی ادا کون لے گیا

صریرِ خامہ

سیاست دان کھُل کھیلے، عزائم میں فتور آیا
کچھ اس انداز سے پنجاب میں یومِ شعور آیا

خروشِ حلقۂ زنجیرِ گُل بانگِ چمن ٹھہرا
پسِ دیوارِ زنداں کوئی دیوانہ ضرور آیا

یہ عنوانِ خرد شوئی شرابِ خانہ ساز آئی
فیضِ محتسب تشنہ دہانوں تک سرور آیا

لہو کے گھونٹ پی کر ایک دریوزہ گرِ اعظم
نشے میں لڑکھڑاتا میکدہ سے ہو کے چور آیا

فقیہوں کی عبائیں بٹ گئیں رندوں کے حلقے میں
غریبوں کا لہو پی کر لٹیروں میں غرور آیا

عزیزوں کی ستائش، دوستوں کی داستاں لکھی
مجھے جس دن سے شورش شعر کہنے کا شعور آیا

رسائی

فضا کے ساتھ کھیلا، عرصۂ پیکار تک پہنچا
اک افسانہ نئے عنواں سے گیر و دار تک پہنچا

فقیروں کے ارادے قیصر و فغفور تک پہنچے
غریبوں کا لہو، پیمانۂ زردار تک پہنچا

سہی قد نازنینوں کی حیا کا شعلۂ خونیں
فلک انداز محلوں کے در و دیوار تک پہنچا

قیادت کا طلائی ہاتھ حرص و آز کی رَو میں
کنیزانِ وفا کے گیسو و رخسار تک پہنچا

سیاست سیم و زر کی دخترِ فرخندہ اختر ہے
یہ اک سرِّ نہاں سرکار سے احرار تک پہنچا

رسالت کے نگہبانوں کا خونِ انقلاب آور
بہ عنوانِ فغاں، اللہ کے دربار تک پہنچا
بساطِ لالہ و گل کو اُلٹ کر شعلۂ صرصر
خزاں کے رُوپ میں ہر گوشۂ گلزار تک پہنچا
عرب کے سارباں زادوں کا ذوقِ بادیہ پیما
عجم کی کارفرمائی سے "اُس بازار" تک پہنچا
زمانے کی روش پر دعوت و ارشاد کا شکوہ
فقیہانِ حرم کے جبّہ و دستار تک پہنچا
صحافت کی متاعِ بے بہا کا جوہرِ ذاتی
مرے خامہ کی دلاویزیٔ گفتار تک پہنچا

تغیّرات

کچھ دنوں بعد زمانے کی ہوا بدلے گی
وقت کے ساتھ رہ و رسمِ وفا بدلے گی
شاخساروں سے نئے پھول نکل آئیں گے
لالہ زاروں میں شگوفوں کی ردا بدلے گی
آگ لہرائے گی بام و درِ سرمایہ پر
نوجوانوں کی حرارت سے فضا بدلے گی
ہاتھ لپکیں گے امیروں کے گریبانوں پر
خانقاہوں میں فقیروں کی صدا بدلے گی
بجلیاں سوئیں گی مٹی کے گھروں میں کب تک
ابر کڑکے گا، قضا رنگِ وغا بدلے گی
ٹوٹ جائے گا ہر اک حلقۂ زنجیرِ ستم
بے نواؤں کی زبانوں پہ دُعا بدلے گی
اور مرے خامۂ گُل ریز کی بے لوث اڑان
اپنی رفتار بہ اندازِ صبا بدلے گی

کون کیا لے گیا

صُوفی قبائے سیدِ ابرار لے گئے
مُلّا، خروشِ نعرۂ پیکار لے گئے

ذاکر، جلالِ حیدرِ کرار لے گئے
واعظ، کمالِ جُبّہ و دستار لے گئے

بادِ صبا کو بادِ خزاں نے کیا نڈھال
صیّاد، آبروئے سمن زار لے گئے

رہرو تلاشِ منزلِ مقصود میں ہیں گُم
رہبر سکونِ قلب کے آثار لے گئے

دن رات بک رہی ہیں دکانوں پہ عصمتیں
تاجر، متاعِ گیسو و رُخسار لے گئے

دل کا خلوص ذہن کی رفعت، قلم کی آب
اس دَورِ پُردروغ کے اخبار لے گئے

تہذیبِ فکر، جُدّتِ معنی زباں کا لوچ
انورؔ علی کے حاشیہ بردار لے گئے

شورشؔ مرے عزیز رفیقوں کے ولولے
قیدِ فرنگ میں رسن و دار لے گئے

تماشائی

طہراں سے اٹھی ہے گھٹا دیکھتے رہو
تم بھی ہو اس چمن کے خدا دیکھتے رہو

دُنیا و عاقبت کا اسی پر مدار ہے
برطانیہ کے ناز و ادا دیکھتے رہو

صرفِ خزاں ہے حافظ و خیّام کا چمن
بدلی ہے کس طرح سے ہوا دیکھتے رہو

قصرِ شہی کی آب بڑھاؤ کہ وقت ہے
پیرِ حرم کی چاک قبا دیکھتے رہو

طہراں کی سحر میں ہے شامِ ملا کا رنگ
تاریخِ حادثات دغا دیکھتے رہو

تیغ و سناں تھے عرصۂ کرب و بلا کے ساتھ
اب نقشِ پائے پیکِ قضا دیکھتے رہو

ہاں خوب مسکراؤ مُصدّق کی لاش پر
اس خونِ ناروا کو روا دیکھتے رہو

آغشتہ ایم ہر سرِ خارے بخونِ دل
قانونِ باغبانیِ صحرا نوشتہ ایم

نظیری

ناقدو؟

ناقدو! وقت کی رفتار بدلنے کے لیے
میں نے مجبور زبانوں کو نوا بخشی ہے
کجکلاہوں کی رعونت کا اڑایا ہے مذاق
میں نے تاریخ کے چہرے کو ضیا بخشی ہے

سجن افرنگ کو لبیک کہی ہے میں نے
اپنے اسلاف کے بے خوف چلن کی خاطر
نوجواں عمر کے دس سال گزارے میں نے
قید کی گود میں ناموس وطن کی خاطر

تم کبھی اپنے کیے پر بھی نظر ڈالو گے
تم نے کانٹوں کے عوض سر دوشمن بیچے ہیں
تم نے تاریخ کے سینے میں سناں گاڑی ہے
تم نے بے خوف شہیدوں کے کفن بیچے ہیں

اور میں آج بھی اس دورِ ستم پیشہ میں　　کج کلاہوں کی رعونت سے اُلجھ سکتا ہوں
ڈال سکتا ہوں مہ و مہر کے سینے پہ خراش　　برق و باراں کی خشونت سے اُلجھ سکتا ہوں

بارہا سختیٔ قانون کا دل ڈوب گیا　　میری للکار سے انگریز کے ایوانوں میں
اب میں اک "تہمتِ بے جا" کے سوا کچھ بھی نہیں　　دس برس کاٹ کے پنجاب کے ز

اور کچھ روز عزیزوں کا تماشا کر لو!
ڈوب جائے گی شبِ تار سویرا ہوگا
سُرخ پرچم کی اُڑانوں کا سہارا پا کر
رنگ محلوں میں فقیروں کا بسیرا ہوگا

سرودِ رفتہ

دس سال قید و بند میں دفنا چکا ہوں میں
یہ خدمتِ وطن کا صلہ پا چکا ہوں میں

برطانیہ سے روز نبرد آزما رہا
اس جرمِ بے خطا کی سزا پا چکا ہوں میں

احباب ڈھونڈتے ہیں خطابت کے ہمہمے
ان ہمہموں سے دُور کہیں جا چکا ہوں میں

کوندا ہوں مثلِ برق پسِ پردۂ سحاب
ظلماتِ روزگار کو لرزا چکا ہوں میں

دار و رسن کی گود میں چھیڑا ہے سازِ نَو
افسانہ ہائے مہر و وفا گا چکا ہوں میں

اب دیکھتا ہوں گردشِ دوراں کے معرکے
ان معرکوں کے رازِ دروں پا چکا ہوں میں

ہے دشمنوں کے لُطفِ خصوصی سے واسطہ
اب دوستوں کے جَور سے تنگ آ چکا ہوں میں

ٹوٹے ہُوئے دلوں کی دُعا رہ گیا ہوں میں
اک سازِ تشنہ کامِ صدا رہ گیا ہوں میں

استفسار

وقت نے اک نئے انداز سے انگڑائی لی — رہنما جادۂ تسلیم و رضا چھوڑ گئے
شہسواروں کی جبینوں پہ پسینہ چھلکا — راہرو، شیوۂ مردانِ وغا چھوڑ گئے

رسن و دار کے مطلع پہ غبار آ ہی گیا — ایک بے خوف صدا ڈوب گئی، ختم ہُوئی
شب کی پُر ہول سیاہی کا مقدّر جاگا — صبحِ خنداں کی ضیا ڈوب گئی، ختم ہُوئی

رُک گئی وقت کے اس موڑ پہ تاریخ کی رَو — اجنبی دَور بہ عنوانِ دغا جیت گیا
حیف صد حیف شگوفوں سے لہو بہتا ہے — وائے بر حالِ چمن، عہدِ چمن بیت گیا

دردمندوں کو وفاؤں کا صلہ مل کے رہا — چند ایثار کے پیکر تھے، مگر ہار گئے
سالہا سال پھریروں کو اڑانیں بخشیں — آج اس بزم سے اُٹھے تو نگوں سار گئے

دیکھ اب راہ نوردانِ رہِ عشق و وفا دھجیاں بیچنے اُٹھے ہیں گریبانوں کی
بُجھ گئے جرأت و ایثار کے "بے لوث چراغ" ہر گئی بازی اخلاص گراں جانوں کی

ایک پُر درد کہانی ہے مگر کس سے کہوں جانتا ہوں کہ مشیّت بھی تماشائی ہے
دیکھ کوندی ہے نشیمن پہ کوئی برقِ بلا دیکھ ہر ذرّہ پہ تاریخ اُبھر آئی ہے!

لالہ زاروں میں شگوفوں سے صبا پُوچھتی ہے
اب بھی "جمہورِ عنادل" کی نوا گونجے گی؟
سُرخ پرچم کی اُڑانوں کا "سہارا" لے کر
اب بھی شمشیرِ برہنہ کی صدا گونجے گی؟

○

۱۹۴۹ء میں احرار نے مسلم لیگ میں ادغام کا فیصلہ کیا تھا۔ اس میں بعض خاص کنایات ہیں جنہیں ایک سیاسی مزاج داں ہی سمجھ سکتا ہے۔

۱

اعتراف

ہے مُبارک یہ مری جُرات گُفتار مجھے
کیا تماشا ہے ڈراتے ہیں ستمگار مجھے

کج کُلاہوں کے در و بام بلا ڈالے ہیں
اپنے اس جرم کی شدّت کا ہے اقرار مجھے

معذرت، شیوۂ مردانِ اُولو العزم نہیں
آج بھی اپنی صداقت پہ ہے اصرار مجھے

شعلہ ہائے گُل و لالہ میں نظر آتے ہیں
خانہ ویرانیٔ صیّاد کے آثار مجھے

عہدِ انگریز سے اس دَورِ ہمایُونی تک
قید خانوں نے پُکارا ہے کئی بار مجھے

خود مرے خون سے نکھری ہُوئی تلواروں نے
مسکراتے ہوئے دیکھا ہے سرِ دار مجھے

میری دولت، مرے جمہور کی خوشنودی ہے
خان و سردار سمجھتے ہیں گنہگار مجھے

وُہ بھی اب اپنے گریباں سے خبردار رہیں
جو ڈراتے ہیں حریفانِ سیہ کار مجھے

اور کہتی ہے

صبا کچھ اور کہتی ہے، فضا کچھ اور کہتی ہے
چمن میں غنچہ و گُل کی ہوا کچھ اور کہتی ہے

ترا حُسنِ تلطّف حاصلِ عُمرِ الم کیوں ہو
تری چشمِ تغیّر آشنا کچھ اور کہتی ہے

سنبھل اے لغزشِ پا، جائزہ لے رنگِ محفل کا
ٹھہر اے دل، کہ بُنیادِ وفا کچھ اور کہتی ہے

ہنر مندوں کو آخر کون دامن میں جگہ دے گا
فقیہانِ سیاست کی ادا کچھ اور کہتی ہے

حرم رُسوا ہے، پیرانِ حرم سر در گریباں ہیں
مگر اب گردشِ ارض و سما کچھ اور کہتی ہے

بقولِ حضرتِ اختر خدا رحمت کرے ان پر
"کہ اس موسم میں دہلی کی فضا کچھ اور کہتی ہے"

محسوسات

ایک میں ہوں اور مرے احوال پر یلغار ہے
انقلاباتِ زمانہ کی عجب رفتار ہے

دولتِ دیں کے محافظ ہیں فقیہانِ حرم!
ملّتِ بیضا کا ہر غدّار اب سردار ہے

اب سفیہوں کی جبینیں بھی شکن آلود ہیں
اب رذیلوں میں غرورِ ہمّت و ایثار ہے

بے سر و پا ہے خطیبِ شہر کا رنگِ کلام
چند بے عنوان باتوں پر اسے اصرار ہے

کچھ عزیزوں کی ثنا، کچھ دوستوں کا شکریہ
ان دنوں شورش مرا سرمایۂ گفتار ہے

شہپرِ جبریل

خورشیدِ زرنگار کی طلعت فضا میں دیکھ
فطرت کے پیرہن کی لطافت صبا میں دیکھ

میرِ امم کے عشقِ جہاں تاب کا خروش !
خیرُ الامم کے جذبۂ مہر و وفا میں دیکھ

تسخیرِ کائنات کی تفسیرِ دل فریب !
خیبر شکن کی ضربتِ مُشکل کشا میں دیکھ

بیدار ہو رہے ہیں جوانانِ ایشیا !
اقبال کے نفس کی حرارت فضا میں دیکھ

جاہ و جلالِ شہپرِ جبریل کا شباب
شورش مرے قلم کی شکستِ نوا میں دیکھ

سوچ

کیا ہیں سحر و شام، میں اس فکر میں گُم ہوں
اے وقت مجھے تھام، میں اس فکر میں گم ہوں

ہر آن غریبوں پہ حوادث کی ہے یلغار
ہر سمت ہے کہرام، میں اس فکر میں گم ہوں

انساں کا لہو بادۂ گلگوں ہے تو کیوں ہے
اے گردشِ ایّام، میں اس فکر میں گم ہوں

تعزیر کے پہرے ہیں نواہائے جنوں پر
ہر سمت ہے اک دام، میں اس فکر میں گم ہوں

یارانِ سبک رو ہیں مشیّت سے گلہ مند
فطرت پہ ہے الزام، میں اس فکر میں گم ہوں

اب بادیہ پیمائے وفا خوار و زبوں ہیں
ایثار ہے ناکام، میں اس فکر میں گم ہوں

اپنوں کی خطا ہو کہ پرایوں کی دغا ہو
احرار ہیں بدنام، میں اس فکر میں گم ہوں

محصُور ہے نافہمِ معنّی کی نوا میں
اقبالؒ کا پیغام، میں اس فکر میں گم ہوں

بازار

قلم بک رہے ہیں، نوا بک رہی ہے
چمن بک رہے ہیں، صبا بک رہی ہے

ادھر جنسِ بازار ہیں ماہ و پرویں
ادھر عارضوں کی حیا بک رہی ہے

ادھر مہر و مہ ہیں اندھیروں کی زد میں
ادھر مہ وشوں کی ردا بک رہی ہے

ادھر کارواں منزلیں ڈھونڈتے ہیں
ادھر شہرتِ رہنما بک رہی ہے

نواہائے فطرت کا دل ڈوبتا ہے
شہیدوں کی گلگوں قبا بک رہی ہے

ہر گام پیکِ اجل دیکھتا ہوں
ہر راہ جنسِ وفا بک رہی ہے

درِ مے کدہ سے سوادِ حرم تک!
ہر اک شے بنامِ خدا بک رہی ہے

کھیل

یا رب ترے بندوں سے قضا کھیل رہی ہے
اک کھیل بہ عنوانِ دعا کھیل رہی ہے

جس کھیل کو صرصر نے بھی کھیلا نہ چمن میں
اس کھیل کو اب بادِ صبا کھیل رہی ہے

اُلجھے ہُوئے حالات کے تیور ہیں خطرناک
بدلے ہُوئے موسم کی ہوا کھیل رہی ہے

رندانِ تہی دست سزاوارِ سبو ہیں!
ٹوٹی ہُوئی توبہ سے گھٹا کھیل رہی ہے

لغزیدہ قدم اذنِ خرد مانگ رہے ہیں
دُزدیدہ نگاہوں میں حیا کھیل رہی ہے

اورنگِ شہی ہیچ ہے رندوں کی نظر میں
محلوں کی بلندی پہ قضا کھیل رہی ہے

احرام سے، جبّے سے، مُصلّے سے، عبا سے
شورش مری بے خوف نوا کھیل رہی ہے

گوروں کا قبرستان

اک تماشا دید کے قابل تھا اُس میدان میں
رُک گیا کچھ دیر میں گوروں کے قبرستان میں

غور سے دیکھا تو ہر مرقد کا سینہ چاک تھا
سنگِ مرمر کی صلیبوں پر غلافِ خاک تھا

حاکمیت کی شکستہ ہڈّیاں نم ناک تھیں!
دَورِ استبداد کی خونیں قبائیں چاک تھیں

اضطرابِ حشر تھا ہر تُربتِ خاموش میں
جان بل کی ذرّیت تھی موت کی آغوش میں

اوڈوائر کا سفینہ غرق تھا منجدھار میں
گاربٹ کی قبر کا کتبہ تھا ظلمت زار میں

مرقدوں کے دل دھڑکتے تھے ہوا کی چال پر
اجنبی روحیں پریشاں تھیں زبُوں اعمال پہ

شُکرِ ایزد ان لٹیروں سے وطن آزاد ہے
ان کا استبداد پاکستان کی بُنیاد ہے

یومِ استقلال

چند جُھرمٹ ہرنیوں کے پھر رہے تھے مال پر

اک تماشا دیدنی تھا یومِ استقلال پر

عیدِ آزادی کا رنگ و نُور تھا پرتَو فگن

ہم نشینانِ قلوپطرہ کے خد و خال پر

چوکڑی بھرتی نظر آتی تھیں زلفوں والیاں!

چاندنے ہالہ بنا رکھا تھا ان کی چال پر

"گُفتہ شاعر" تھا پلکوں کی گھنیری چھاؤں میں

ثبت تھے بے نام افسانے شگفتہ گال پر

آنچلوں کی سرسراہٹ تھی کہ حرفِ اعتذار

مغویہ زہرہ وشوں کی عصمتِ پامال پر

اور یہ سب دیکھ کر شورش خیال آیا مجھے

خندہ زن اس سال کے جلوے ہیں پچھلے سال پر

۲

ایک ریستوران میں کچھ افسروں کے درمیاں
بے تکلّف بحث کا آغاز تھا اقبالؒ پر

اس طرح الفاظ اُڑتے تھے بہر انداز بحث
سایۂ رُوح الامیں ہو جیسے قیل و قال پر

وقت کے پامال عنواں بھی تھے موضوعِ کلام
ہو رہا تھا تبصرہ ہندوستاں کی چال پر

دُختِ رز کا احمریں ساغر اُٹھا کر ہاتھ میں
ہر کوئی مغمُوم تھا ملّت کے خستہ حال پر

چودھری افضل حق کے مزار پر

اے قائدِ مرحُوم تماشائے وفا دیکھ
تُربت سے نکل اپنے عزیزوں کی ریا دیکھ

آ دیکھ گریبانِ گُل و لالہ کا انجام
کِس جُرم میں ملتی ہے بہاروں کو سزا دیکھ

اک بار تو ویرانیٔ منزل پہ نظر ڈال
اک بار تو یارانِ سبک گام کو آ دیکھ

اے میرِ سپہ! آہ، ترے قافلے والے
اب چھوڑ چکے ہیں ترا نقشِ کفِ پا دیکھ

اک بار تو اے ساکنِ فردوس پلٹ آ
جو ہم پہ گذرتی ہے وہ اک بار تو آ دیکھ

ہر موڑ پہ اک برقِ ستم کوند رہی ہے
ہر گام پہ ہے شعلہ فشاں سیلِ بلا دیکھ

شورش کی رگِ جاں پہ خود اپنوں کی چھُری ہے
اس دَورِ ستم پیشہ میں کیا کیا ہے روا دیکھ

ممکن ہو تو فردوس سے اِک بار چلا آ
اے لشکرِ بے جان کے سالار چلا آ

اب کوئی یہاں قافلہ سالار نہیں ہے ۔۔۔ احرار تو ہیں، قائدِ احرار نہیں ہے
ناپید ہے اب خندۂ شمشیرِ برہنہ ۔۔۔ اب ولولۂ عرصۂ پیکار نہیں ہے
اب رسمِ وفا عیب ہے دُنیا کی نظر میں ۔۔۔ اب حلقۂ احباب میں ایثار نہیں ہے
گو ہمّتِ یک گام پہ موقوف ہے منزل ۔۔۔ لیکن کوئی منزل کا طلب گار نہیں ہے
سب میرے گریباں کی طرف دیکھ رہے ہیں ۔۔۔ اور میرے گریباں میں کوئی تار نہیں ہے
کچھ لوگ مری تلخ نوائی سے خفا ہیں ۔۔۔ لیکن مجھے اس جرم سے انکار نہیں ہے

احرار رہ و رسمِ وفا چھوڑ چُکے ہیں
یہ جادۂ تسلیم و رضا چھوڑ چُکے ہیں

اسدُ اللّٰہی

کون اب جُرأتِ قربانی و ایثار کرے
کون اب عظمتِ اسلام کا اظہار کرے

کون تاروں کے نشیمن پہ کمندیں پھینکے
کون خورشید کو ذرّوں پہ نگوں سار کرے

کون شبنم سے جلائے گل و لالہ کے چراغ
کون فانُوسِ جہاں تاب کو ضَو بار کرے

کون تقلیدِ براہیم کو ایماں سمجھے!
کون اب آتشِ نمرُود کو گلزار کرے

کون یارانِ ستم خُو سے ملائے آنکھیں
کون اربابِ سیاست کو خبردار کرے

کون فطرت کے غوامض سے نقابیں اُلٹے
کون سنگینیٔ حالات پہ یلغار کرے

ثبت ہے چہرۂ تاریخ پہ اقبالؒ کا قول
اس کی تُربت پہ خُدا بارشِ انوار کرے

فتنۂ ملّتِ بیضا ہے، امامت اس کی
جو مسلماں کو سلاطیں کا پرستار کرے

الحذر

حذر اے خواجگی اس دَور کی خونیں نواؤں سے
اُلجھنے کو ہے محنت تیری بوسیدہ قباؤں سے

جبینیں خوار ہیں شیخِ حرم کے آستانے پر
جھلکتی ہے خشونت خانقاہوں کی فضاؤں سے

ادھر زُہّاد کی تقدیس پر ابلیس ہنستا ہے!
ادھر دست و گریباں ہے زمانہ بے نواؤں سے

مری آواز پر چیں بر جبیں محراب و منبر ہیں
شکایت ہے "فقیہِ شہر" کو میری صداؤں سے

ابھی تک تیغِ استبداد کے شعلوں میں دم خم ہے
ابھی تک بُوئے خوں آتی ہے سُلطانی عباؤں سے

زلیخا زادیاں بیباک ہیں بازارِ عصمت میں !!
نمایاں ہیں لہو کے داغ عفّت کی رداؤں سے

ابھی تک داستانِ ظالم و مظلوم باقی ہے
ابھی تک کھیلتے ہیں کھیلنے والے قضاؤں سے

کہاں جاؤں یہاں ہے قحط میرے ہم خیالوں کا
اُلجھنا چاہتا ہوں دَورِ حاضر کے خداؤں سے

لمحۂ فکریہ

دوست یہ کیوں ہے، یہ کیا ہے؟ مجھے کچھ سوچنے دے
ہر طرف حرص و ہوا ہے، مجھے کچھ سوچنے دے

بھوک کی آگ سے روشن ہیں در و بامِ حیات
گھات میں پیکِ قضا ہے، مجھے کچھ سوچنے دے

آستانوں سے اُلجھتا ہے جبینوں کا جلال!
اک تماشائے دعا ہے، مجھے کچھ سوچنے دے

رہگزاروں پہ تہی دست فقیروں کا ہجوم!
کس قدر ہوش رُبا ہے، مجھے کچھ سوچنے دے

عصمتِ زہرہ وشاں، عفّتِ سیمیں بدناں
رہنماؤں کی غذا ہے، مجھے کچھ سوچنے دے

ہم نشینانِ زلیخا کے بدن کی نزہت!
خان زادوں کو روا ہے، مجھے کچھ سوچنے دے

روز بازار کی زینت ہیں کنیزانِ حرم
اور پھر اُن کا بھی خدا ہے، مجھے کچھ سوچنے دے

کوئی پوچھتا نہیں

انسان ہے بے قرار کوئی پوچھتا نہیں — فطرت ہے اشکبار کوئی پوچھتا نہیں
بکھری پڑی ہیں جیب و گریباں کی دھجّیاں — داماں ہے تار تار کوئی پوچھتا نہیں
نو رستہ کونپلوں کی قبائیں ہیں چاک چاک — زخمی ہے لالہ زار کوئی پوچھتا نہیں
اشجارِ باغ ماتمِ گل میں ہیں سرنگوں — بے رنگ ہے بہار کوئی پوچھتا نہیں
کچھ ہمرہانِ سست عناصر کی زد میں ہے — تقدیرِ روزگار کوئی پوچھتا نہیں
اے جانِ نو بہار، کہاں ہے، کدھر ہے تو — ویراں ہیں برگ و بار کوئی پوچھتا نہیں
پلتے ہیں سیم و زر سے رعونت کی گود میں — اربابِ اختیار کوئی پوچھتا نہیں
ہے نظمِ انقلاب سفیہوں کے ہاتھ میں — "پھرتے ہیں میرؔ خوار کوئی پوچھتا نہیں

اس عاشقی میں عزّتِ سادات بھی گئی"

بلالِ مشرق

لہُو کی آب ہے جمہُور کے نگینوں میں
قضا کا زنگ ہے ہستی کے آبگینوں میں

شریک ہو گئے حلقہ بگوشِ میرِ اُمم!
نظامِ زر کی سیاست کے خوشہ چینوں میں

حذر، حذر کہ ابھی تک مفاد کے بُت ہیں
خدا فروش فقیہوں کی آستینوں میں

فغاں بلب ہیں ابھی دخترانِ لالہ و گُل
ابھی چراغ ہیں زردار کے دفینوں میں

خدا کے خوف سے پرہیز اک قرینہ ہے
بُتانِ حاضر و موجود کے قرینوں میں

لرز رہی ہے تھپیڑوں میں گردشِ دوراں
خروشِ لطمۂ امواج ہے سفینوں میں

نوید دی ہے عجم کو بلالِ مشرق نے
"اگرچہ بُت ہیں جماعت کی آستینوں میں

مجھے ہے حُکمِ اذاں لا الٰہ الا اللہ"

خیبر

سوا ہے سیر کا منظر قریشی کی معیت میں
کھلے ہیں یاسمن کے پھول خیبر کی چٹانوں پر

ادھر بکھرے پڑے ہیں چوٹیوں پر برف کے موتی
اُدھر اک نور سا پھیلا ہوا ہے آسمانوں پر

صبا اٹھلا رہی ہے طورخم سے لنڈی کوتل تک
نوائے تہنیت ہے کوہساروں کی زبانوں پر

جوانانِ قبائل کی جبینیں جگمگاتی ہیں
ہزاروں داستانیں ثبت ہیں ان کی سنانوں پر

قضا سے کھیلنے والے اسی تیور سے رہتے ہیں
کہ شعلے ہوں لہو میں اور بندوقیں ہوں شانوں پر

رسول اللہ کا دامانِ رحمت سایہ گستر ہو
خدا کا فضل ہو ان مملکت کے پاسبانوں پر

بالآخر ڈوب ہی جاتی ہے استبداد کی کشتی
یہ عقدہ وا ہوا ہے چارسدہ کے پٹھانوں پر

مسجدِ عالمگیر

ہلالِ عید کے چہرے پہ ہے گردِ غبار اب تک
فقیہِ شہر سے اسلام ہے شکوہ گزار اب تک
جلالِ منبر و محراب ہے حجّاج کی زد میں
ابوسفیان کی اولاد ہے گردُوں وقار اب تک
اذانوں میں نہفتہ خنجرِ قاتل کا خدشہ ہے
جبینوں سے لہُو کی سُرخیاں ہیں آشکار اب تک
ادیبوں کی زباں پر خوف کی سنگین مُہریں ہیں
صحافی جور و استبداد کے ہیں پردہ دار اب تک
عظیم الشّان میناروں سے یہ آواز آتی ہے
"ہزاروں دولتوں کا اُڑ چکا ہوگا غبار اب تک
مگر ہے شانِ عالمگیرِ اعظم برقرار اب تک"

ناگفتہ بہ

ہر سینۂ چمن میں ناسُور ہیں تو کیوں ہیں
یارب یہ تیرے بندے مجبور ہیں تو کیوں ہیں
شاید صبا کی نکہت صرصر میں گھُل چکی ہے
یہ غنچہ ہائے عصمت بے نُور ہیں تو کیوں ہیں
خونِ شفق کی ضَو ہے محلوں کے حاشیے پر
پیکِ قضا کی زد میں جمہُور ہیں تو کیوں ہیں
تعزیر چاٹتی ہے خونِ رگِ خطابت
اقبالؔ کی نوائیں مقہُور ہیں تو کیوں ہیں
ذرّوں کے دل کی دھڑکن اب تیز ہو چلی ہے
لیکن یہ ماہ و انجم معذور ہیں تو کیوں ہیں
بطحا کی وادیوں سے آواز آرہی ہے
اسلام کے رجز خواں رنجور ہیں تو کیوں ہیں
سرکار کی روِش پر احباب پوچھتے ہیں
احرار کی سنائیں مستور ہیں تو کیوں ہیں؟

انتخاب

قوم کے ہمدرد جاگ اٹھے کہ ابھرا آفتاب
اوڑھ لی ہر راہزن نے رہنمائی کی نقاب
انتخاب —— انتخاب اے انتخاب

جگمگا اٹھا فقیہہِ شہر کا مدّھم چراغ
بیچتے پھرتے ہیں واعظ سینۂ مِلّت کے داغ
انتخاب —— انتخاب اے انتخاب

اب کئی خدّام اس سانچے میں ڈھالے جائیں گے
آستینِ قوم میں کچھ سانپ پالے جائیں گے
انتخاب —— انتخاب اے انتخاب

راہبر ایسے کہ جیسے اشجع و پامرد ہیں
جعفر و صادق کے بیٹے قوم کے ہمدرد ہیں
انتخاب —— انتخاب اے انتخاب

اے غریبو! فصلِ گُل آئی ہے گلشن لُوٹ لو
پھر کہاں یہ رہنما، ان کے نشیمن لُوٹ لو

انتخاب —— انتخاب اے انتخاب

سب یہ بنجارے ہیں وُہ جن کا لہو بیوپار ہے
ان میں ہر سیّاس اپنے وقت کا غدّار ہے

انتخاب —— انتخاب اے انتخاب

ان کے دامن پہ ہزاروں عصمتوں کا خون ہے
ان کے چہرے کی سپیدی زہر گوں مضمُون ہے

انتخاب —— انتخاب اے انتخاب

اے غریبو! اب سنبھل جاؤ خدا کے واسطے
ان کا دامن پھاڑ دو، اپنی ردا کے واسطے

انتخاب —— انتخاب اے انتخاب

مشورہ

اربابِ سیاست کی سیادت سے گذر جا
منزل سے اُٹھا ہاتھ، مسافت سے گذر جا

الفاظ و عمل میں کوئی رشتہ نہیں زنہار
واعظ کی "دلآویز" خطابت سے گذر جا

لا دین حلیفوں کی معیّت سے حذر کر
پُر پیچ عباؤں کی امامت سے گذر جا

مومن ہے تو دامانِ محمّد میں چلا آ
پیرانِ صنم خُو کی اطاعت سے گذر جا

لازم نہیں بے درد زمانہ کی شکایت
یارانِ سرِپُل کی حمایت سے گذر جا

معلوم نہیں کیوں؟

یوں گردشِ ایّام ہے، معلوم نہیں کیوں
رندوں کا لہو عام ہے، معلوم نہیں کیوں

مفلس ہے تو اک جنسِ فرومایہ ہے لاریب
مُخلص ہے تو ناکام ہے، معلوم نہیں کیوں

تہمت کے سزاوار فقیہانِ حرم ہیں
مُلّا یہاں بدنام ہے، معلوم نہیں کیوں

اب خُون کے دھبّے ہیں مدیروں کی قبا پر
خامہ دمِ صمصام ہے، معلوم نہیں کیوں

خونِ رگِ اسلام ہے زہراب وضو تک
ابہام ہی ابہام ہے، معلوم نہیں کیوں

ہر بات پہ تعزیر ہے ہر قول پہ زنجیر!
ہر شاخ پہ اک دام ہے، معلوم نہیں کیوں

جمہور کی یلغار سے ہم قصرِ شہی میں
کہرام ہی کہرام ہے، معلوم نہیں کیوں

عیدِ قرباں

اس دورِ پُر آشوب میں اے عید نہ آ تُو
آئی ہے تو اسلوبِ براہیم سکھا تُو
کشمیر کی جنّت سے شہیدوں کا لہو مانگ
طاغوت کو اسلام کی طاقت سے ہرا تُو
خوں بن کے مُصدّق کے رگ و پے میں اُتر جا
تہران کے اَیوان کی توقیر بڑھا تُو
کونین کے آقا کی رسالت کے عَلم کھول
توحید پرستوں کو سکھا صبر و رضا تُو
واماندگیٔ شرعِ پیمبر کی خبر لے!
خیبر کی حدیں سرحدِ سلہٹ سے ملا تُو
اک نغمۂ جاں سوز بہ عنوانِ وفا چھیڑ
کونین کو دے اس کے تأثّر سے جلا تُو
آفاق سے پیمانۂ مہتاب طلب کر!
شاعر کے دل آویز خیالوں میں سما تُو

حسینؓ ابنِ علیؓ

کون ناموسِ رسالت کا نگہباں ہو گیا
کس کا سر نیزے کو پہنچا، کون قرباں ہو گیا

کس کے آنسو چہرۂ نوروز کی رونق بنے
کس کا خوں اسلام کی صبحِ درخشاں ہو گیا

کس کی شہ رگ پر یزیدی ہاتھ اُٹھے بیدریغ
کون تھا جس کا لہُو تفسیرِ قرآں ہو گیا

کس کی نعشِ خوں چکاں تشہیر کو لائی گئی
کس کا پرچم چادرِ گورِ غریباں ہو گیا

کس نے کی مرگِ ملوکیّت کی صُبحِ اوّلیں
کون شمعِ ظُلمتِ شامِ غریباں ہو گیا

کون تڑپایا گیا ہے کربلا کی خاک پر
کس کا ماتم، ماتمِ تاریخِ انساں ہو گیا

کُل بہتّر فرد میدانِ وغا میں ڈٹ گئے
شمر کے ہاتھوں محمدؐ کے نواسے کٹ گئے

"سرکاری یومِ اقبال"

یہ طائرِ چمن ہے چمن سے نکال دو
اس خوش نوا کو سرو و سمن سے نکال دو

ہر مصلحت شناس سے لو درسِ آگہی
ہر بے نوا کو اس کے وطن سے نکال دو

لادین قوتوں کی حمایت کے نام پر
ذکرِ خدا کو شعر و سخن سے نکال دو

لازم نہیں فسانۂ حلاجؒ کا شعور
اس کو کتابِ دار و رسن سے نکال دو

اعلان سن رہے ہو عزیزانِ محترم
روحِ محمدؐ اپنے بدن سے نکال دو

"اقبال کے نفس سے ہے لالے کی آگ تیز
ایسے غزل سرا کو چمن سے نکال دو"

یادِ ایام

زیادہ دن نہیں گذرے یہاں کچھ لوگ رہتے تھے
جو دل محسوس کرتا تھا، علی الاعلان کہتے تھے
گریباں چاک دیوانوں میں ہوتا تھا شمار ان کا
قضا سے کھیلتے تھے، وقت کے الزام سہتے تھے

لپکتی تھیں ہزاروں بجلیاں اُن کے نشیمن پر!
چٹانوں کی جبیں پہ نقش تھا جاہ و جلال اُن کا
ابوذرؓ کی روایاتِ درخشاں اُن کا محور تھیں
حسینؑ ابنِ علیؑ کی پیروی ہی تھا کمال اُن کا

اُٹھے تو کوہساروں کی بلندی ہمرکاب آئی
بڑھے تو خیر مقدم کو سنانیں مُسکرا اُٹھیں
گئے تو داغ ہائے ہجر سے سینے سُلگ اُٹھے
چلے تو حادثوں سے شاہراہیں جگمگا اُٹھیں

کبھی کشمیر اُن کے عزم و ہمّت کی نشانی تھا
کبھی دہلی کے لالہ زار اُن سے لہلہاتے تھے
کبھی لاہور اُن سے اکتسابِ فیض کرتا تھا
کبھی اُن سے خداوندانِ لندن تھرتھراتے تھے

مجاہد اور بھی پنجاب میں پیدا ہُوئے شورش
کہاں قربانی و ایثار میں لیکن جواب اُن کا
ہمیشہ بہ سرِ میدان سینہ تان کر نکلے
نکھرتا ہی رہا تیغوں کے سایے میں شباب ان کا

مگر اب گردشِ دوراں کے ہاتھوں خاک اُڑتی ہے
اور اُن کی بادیہ پیمائیاں ماضی کا قصّہ ہیں
اب ان کی چاک دامانی پہ استبداد ہنستا ہے
اور ان کے نام لیوا ہر نئے ظالم کا حصّہ ہیں

سات رنگ

دوش پر سنبل و ریحاں کے صبا آتی ہے
پھر مجھے یادِ عزیزانِ وفا آتی ہے
بدلیاں بر سرِ لاہور عبیر افشاں ہیں
اُفقِ ہند سے گھنگھور گھٹا آتی ہے
چھ برس بعد مسوری کے کُہستانوں سے
یادِ احباب بہ عنوانِ صبا آتی ہے
طورِ خم جلوہ گہِ ناز نظر آتا ہے
خیبر اور اس کی چٹانوں سے ہوا آتی ہے
شاخساروں پہ ستاروں کے کنول روشن ہیں
لالہ زاروں میں کوئی زہرہ ادا آتی ہے
خان زادوں کے لیے گیت بنے جاتے ہیں
قید خانوں سے بلکنے کی صدا آتی ہے

علی الصّباح

پو پھٹتی ہے مسجد میں اذاں گونج رہی ہے
تکبیرِ خداوندِ جہاں گونج رہی ہے

توصیف و ثنا ہے گل و لالہ کی زباں پر
تقدیسِ شہِ کون و مکاں گونج رہی ہے

ہر شاخِ چمن نور کے تڑکے کا علم ہے
ہر ذرۂ گیتی کی زباں گونج رہی ہے

ہے نغمۂ توحید مؤذّن کی صدا میں
یا غیرتِ شمشیرِ رواں گونج رہی ہے

ہے گنبد افلاک میں آوازۂ فطرت
یا جادۂ منزل پہ اذاں گونج رہی ہے

وہ نالۂ شب تاب کہاں سو گیا جا کر
یہ آہِ سحر تاب کہاں گونج رہی ہے

کیا شے یہ ہنسی پردۂ مینا سے نکل کر
ٹوٹی ہوئی توبہ کی فغاں گونج رہی ہے

قصیدے لکھو

قصر و دربار کی عظمت کے قصیدے لکھو
بادشاہوں کی جلالت کے قصیدے لکھو

آستانوں پہ عقیدت کے لٹاؤ موتی
پیرزادوں کی سیادت کے قصیدے لکھو

سالہا سال سے یہ رسم چلی آتی ہے
خان زادوں کی شرافت کے قصیدے لکھو

زخم کھائے ہوئے چہروں کا اُتارو نقشہ
چوٹ کھائی ہوئی عصمت کے قصیدے لکھو

ہم نشینانِ زلیخا کی بکھیرو زلفیں
چشم و عارض کی نفاست کے قصیدے لکھو

عشرتِ شب کی رعایت سے اڑاؤ پرچم
بانوئے شہر کی عظمت کے قصیدے لکھو

بھوک کو اپنے بزرگوں کی وراثت سمجھو
اہلِ دولت کی شقاوت کے قصیدے لکھو

تند افکار کو خوراک میں دو برق و شرار
چہرۂ شب کی لطافت کے قصیدے لکھو

اس چمن زار میں رہنا ہے تو اک کام کرو
اپنے انمول خیالات کو نیلام کرو

کیا خبر جراتِ گفتار رہے یا نہ رہے
جوں کی توں عظمتِ کردار رہے یا نہ رہے

وقت کے دل میں بھڑکتی رہے اوہام کی آگ
دعوتِ نعرہ و پیکار رہے یا نہ رہے

ہر طرف شعلۂ تخریب کی موجیں لپکیں
روحِ قربانی و ایثار رہے یا نہ رہے

میری آواز پہ قانون کی سُرخ آنکھیں ہوں
میرے دامن میں کوئی تار رہے یا نہ رہے

کیا تعجب ہے حوادث کی سبک راہوں میں
کوئی مُونس کوئی غم خوار رہے یا نہ رہے

شعر اک بوجھ ہے شاہوں کی طبیعت کے لیے
کل یہاں ایک بھی فنکار رہے یا نہ رہے

زندگی چاہو تو رحمت کے قصیدے لکھو
خان زادوں کی سیاست کے قصیدے لکھو

هر نظمِ گوهریں کہ بیادِ تو گفتہ ام
دل خستہ کردہ و جگرِ خویش سُفتہ ام

فیضی

ترے حضور

بہشت نذر کروں ، لالہ زار نذر کروں
سرودِ میکدۂ نوبہار نذر کروں
کہوں حوادثِ عالم کی داستانِ دراز
فسانہ ہائے غمِ روزگار نذر کروں
شروعِ عشق کی بے تابیاں کروں حاضر
مآلِ شوق کے لیل و نہار نذر کروں
ستم شعار عزیزوں کی داستاں لکھوں
نوائے خاطرِ آشفتہ کار نذر کروں

تراشش نُوں لبِ زہرہ وشاں سے نغمۂ نَو
نسیمِ گیسُوئے مشکیں بہار نذر کروں
گلاب و سرو و سمن کی حکایتیں لکھوں
گلُاب و سرو و سمن کا نکھار نذر کروں

چراغِ دیر سے روشن کروں سوادِ حرم!
متاعِ دیدۂ خونناب بار نذر کروں
ادب کا رنگ نکھاروں، زباں کا رُخ بدلوں
قلم کا نعرۂ مستانہ وار نذر کروں

"قلم زُنکتہ فرو ماند و رازِ من باقیست
بضاعتِ سخن آخر شد و سخن باقیست"

ربیعہ

وُہ اس شورش گہِ ہستی میں فطرت کی کہانی ہے
صبا کے رُوپ میں ہر شاخِ گُل کو گدگداتی ہے
عروسِ کہکشاں کے پیرہن میں جگمگاتی ہے
وُہ اک بُت خانۂ عفّت کی پاکیزہ جوانی ہے
یہ اُس کی نازنیں تصویر سے محسوس ہوتا ہے
کہ جیسے چاندنی آبِ رواں پر جھلملاتی ہے
کرن جس طرح ہر کونپل کے دل کو گدگداتی ہے
یہ اُس کی دل نشیں تحریر سے محسوس ہوتا ہے
شرابِ شعر کی تفسیرِ شاعر کی زبانی ہے
وُہ اس دارُالمحن میں شعلۂ مہتاب ہے گویا
عروسانِ چمن کا یاسمینی خواب ہے گویا
وُہ فطرت کا حسیں شہ کار ہے اور غیر فانی ہے
وُہ اک پیکر ہے جس کو چاندنی راتوں نے پالا ہے
ربیعہ کون ہے؟ صحرائے فطرت کی غزالہ ہے

گلستانِ فاطمہ میں!

نوعروسانِ چمن میں ہر کوئی مغرور ہے
گلستانِ فاطمہ ہے یا جہانِ طور ہے

چاندنی چھٹکی ہوئی ہے یاسمیں کے فرش پر
لالہ و گل کے پیالوں میں شرابِ نور ہے

نغمۂ نَے ہے غزلہائے رواں کی چاپ میں
بادۂ چشمِ غزالاں سے چمن مخمور ہے

نسترن کی شاخِ نازک پر حنائی ہاتھ ہیں
شعلۂ آواز سے روشن چراغِ طور ہے

ذرّہ ہائے خاک ہیں قوسِ قزح سے ہم کلام
پتّی پتّی کی زباں پر نعرۂ منصُور ہے

آنچلوں کے عنبریں سائے ہیں سبزہ زار پر
خندۂ تمکیں سے دامانِ فضا مسرُور ہے

ایک شاعر شاخساروں کی شگُفتہ چھاؤں میں
چند آوارہ خیالوں کے نشے میں چُور ہے

اک نئے مضموں کا عُنواں ہیں سُنہری کونپلیں
اَن کہے شعروں سے دامانِ فضا معمُور ہے

ایسے پس منظر میں اے شورشِ ربعیہ کا خیال
کیا کہوں، وُہ پیکرِ عصمت بہت مجبور ہے

اعترافات

دل پر لگی ہے چوٹ صدا کر رہا ہوں میں
یارب ترے حضور دعا کر رہا ہوں میں

اب لکھ رہا ہوں اپنے عزیزوں کی داستاں
اور جانتا ہوں جرم و خطا کر رہا ہوں میں

اب ذرہ ہائے خاک ہیں گردوں سے ہم کلام
اب کونپلوں کو نغمہ سرا کر رہا ہوں میں

اب جی رہا ہوں گردشِ دوراں کے ساتھ ساتھ
یہ ناگوار فرض ادا کر رہا ہوں میں

دل کیا ہے؟ ایک غم کی خراوانیوں کا نام
یہ غم ہے جس کی نشو و نما کر رہا ہوں میں

اے ربِّ ذُوالجلال تری برتری کی خیر
کن ظالموں کی مدح و ثنا کر رہا ہوں میں

شورش مری نوا سے خفا ہے فقیہِ شہر
لیکن جو کر رہا ہوں، بجا کر رہا ہوں میں

ایک خط

حُسن کس حال میں ہے رنگِ نزاکت کیا ہے؟
میری بیمار ربیعہ! تری حالت کیا ہے؟
تیرے چہرے کی صباحت پہ اُداسی کیسی؟
تیری جاگی ہُوئی آنکھوں کو شکایت کیا ہے؟
تنِ نازک ترا اور آتشِ بے نام کی لَو!
آخر اس کربِ مسلسل کی نہایت کیا ہے؟
اپنے بے درد عزیزوں سے پریشان نہ ہو
اُن کو معلُوم نہیں دردِ محبّت کیا ہے؟
ہجر کی تلخ نوائی کے معانی کیا ہیں؟
عشق کے دامنِ صد چاک کی قیمت کیا ہے؟
تیرا دل تلخیٔ دوراں کی گذرگاہ سہی!!
تیرے جذبات میں احساسِ ہزیمت؟ کیا ہے؟
آج اک خط میں ربیعہ نے لکھا ہے شورش
آپ کس حال میں ہیں، آپ کی حالت کیا ہے؟

قریب آجاؤ

ایک شاعر نے پکارا ہے قریب آجاؤ
آج ہر شعر تمھارا ہے قریب آجاؤ
تم جو چاہو، تو ستارے بھی اُتر آئیں گے
جامِ مہتاب ہمارا ہے، قریب آجاؤ
شفقِ شام نے خونِ دلِ خاور لے کر
اپنے چہرے کو نکھارا ہے، قریب آجاؤ
شاخساروں پہ شگوفوں کے دیے روشن ہیں
ہر کلی ایک ستارا ہے، قریب آجاؤ
وقت کی زُلفِ پریشاں کو بڑی مدّت میں
نُور و نکہت نے سنوارا ہے، قریب آجاؤ
سُرخ گالوں پہ حکایاتِ شبینہ کی خراش
کتنا خاموش اشارا ہے، قریب آجاؤ
اُن کھِلے سُرخ لبوں کا یہ دل آویز سکوں
زندگانی کا سہارا ہے، قریب آجاؤ

مرحُوم یادیں

اس گلستاں سے بوئے لطافت چلی گئی
احباب اُٹھ گئے کہ شرافت چلی گئی

سلمٰی کی شاعرانہ وفا سے گلہ ہی کیا
اختؔر کے ساتھ اس کی محبّت چلی گئی

کچھ دوست داستانِ وفا لے کے اُٹھ گئے
کچھ دوستوں کے ساتھ مروّت چلی گئی

سیمیں بروں میں مہر و وفا کا پتا نہیں
خورشیدِ زرنگار کی طلعت چلی گئی

زہرؔہ کے گیسوؤں کی خنک چھاؤں اب کہاں
ناہیدؔ کے لبوں کی حلاوت چلی گئی

لاؤں کہاں سے بالا و برِ تؔودھ کا جواب
وُہ کیا گئے کہ رسمِ محبت چلی گئی

شورشؔ بچھڑ چکے ہیں عزیزانِ ہم سفر
اور اُن کے ساتھ قلب کی راحت چلی گئی

سلام کہتی ہیں

مرے قلم کی نوائیں سلام کہتی ہیں!
دھڑکتے دل کی صدائیں سلام کہتی ہیں

اِدھر بھی دیکھ، نگاہوں کو پھیرنے والے
کہ یہ اُداس فضائیں سلام کہتی ہیں

کہاں کا زُہد؟ یہ توبہ کی داستاں کیا ہے
سبُو اُٹھا کہ گھٹائیں سلام کہتی ہیں

وُہ بے شمار شگوفے کہ ہیں رہینِ خزاں
اُنھیں چمن کی ہوائیں سلام کہتی ہیں

وُہ سجدہ ہائے ارادت برنگِ آہِ سحر
وُہ نیم شب کی دُعائیں سلام کہتی ہیں

روِش روِش کی زباں پر ہے عرضِ نازونیاز
چمن چمن کی ادائیں سلام کہتی ہیں

ترے لیے یہ عقیدت کے پھول حاضر ہیں
قبُول کر کہ وفائیں، سلام کہتی ہیں

نیا سفر ہے پُرانے چراغ گُل کر دو

ربیعہ آکہ زمانے پہ مُسکرا کے چلیں
بہار بن کے رہیں، ہم قدم صبا کے چلیں

قضا کے رُخ کو بدل دیں بعزمِ عشق جواں
حیات تلخ سہی، اس پہ مسکرا کے چلیں

سہیلیوں سے کہو زاویے بدل ڈالیں!
غزل کی لے میں کوئی گیت گُنگنا کے چلیں

اُفق کے پار شفق رنگ لالہ زاروں میں
چلی چلو تو یہاں سے قدم بڑھا کے چلیں

حیات کیا ہے عناصر کے تجربہ کے سوا
بہشتِ ارض کو خُلدِ بریں بنا کے چلیں

جوانیوں کی نئی ڈالیوں پہ لہرائیں
محبّتوں کے نئے کارواں بنا کے چلیں

شہنشہوں کو جُھکائیں حضورِ محنت میں
قلم کو تیغ بنا کر فضا پہ چھا کے چلیں

عرض و نیاز

سبُو سے ربط بڑھائیں، فضا پہ لہرائیں
یہ سامنے ہے جلوے کدے میں ہو آئیں

لطیف نغمہ الاپیں کہ چاند روشن ہے
عجب نہیں کہ ستارے شراب بن جائیں

ہے ایک رات کی کیا بات، بیت جائے گی
خدا کے واسطے آپ اس قدر نہ شرمائیں

خلوص سر بگریباں، نیازِ خستۂ ناز
جمالِ شعلۂ رُخاں سے فریب کیوں کھائیں

فضا فسُردہ، گُل و لالہ دل گرفتہ ہیں
نقاب رُخ سے اُٹھاؤ کہ پھُول لہرائیں

شبِ وصال کو تنہائی کی ضرورت ہے
سہیلیوں سے کہو، آج رات سو جائیں

"اک اضطرابِ مسلسل غیاب ہو کہ حضُور"
کہاں کہاں دلِ وحشی کو جا کے سمجھائیں

جوابِ آں غزل

ربعیہ! کچھ دنوں سے تلخ ہے گفتار کیا معنی؟
تو ہے میری وفا سے کس لیے بیزار کیا معنی؟

ترے دل کو فسردہ کر رہا ہے "خطرۂ زنداں"
تری صُورت سے پیدا کرب کے آثار کیا معنی؟

چمن کے سینۂ نازک پہ صرصر کے طمانچے ہیں
فضا میں کھیلتا ہے شُعلۂ پیکار کیا معنی؟

وفا و مہر کی پیکر! کبھی سوچا بھی ہے تو نے
ترازو ہیں دلِ سرو و سمن میں خار کیا معنی؟

غزالانِ حسیں کے شیشۂ عصمت مکدّر ہیں
گریبانوں کے نیچے جا رہے ہیں تار کیا معنی؟

ابھی تک کوچہ و بازار میں نیلام ہوتے ہیں
تری ہمجولیوں کے گیسو و رخسار کیا معنی؟

مری تو عادتِ ثانی ہے زندانوں پہ ہنس دینا
مگر، تُو اور اِس پر خوف کا اظہار کیا معنی؟

زمانہ جا رہا ہے کس طرف، اس بات پر سوچیں
مری مانو چلی آؤ کہ اِن حالات پر سوچیں

مُطربِ ساز اُٹھا

مطربِ ساز اٹھا رات چلی جاتی ہے
اک غزل اور سُنا رات چلی جاتی ہے

رات کی رات ستاروں کے کنول کھلتے ہیں
جام میں پھُول کھلا رات چلی جاتی ہے

حادثے عشق کا عنوانِ خصُوصی، ہی سہی
اب انھیں بھُول بھی جا رات چلی جاتی ہے

خُوب ہے نیم نگاہی بھی، مگر وقت نہیں
آنکھ سے آنکھ ملا رات چلی جاتی ہے

وقت کو لوٹ کے آتے بھی کبھی دیکھا ہے؟
آج کی رات نہ جا رات چلی جاتی ہے

اپنے اس ریشمی آنچل کی اُڑانوں پہ نہ جا
کھول دے بندِ قبا رات چلی جاتی ہے

کبھی کبھی

صبا اُداس، چمن اشک بار دیکھا ہے
عجب کرشمۂ لیل و نہار دیکھا ہے

ردائے سرو و سمن چاک چاک پائی ہے
لباسِ لالہ و گل تار تار دیکھا ہے

وفا تو خیر بڑی چیز ہے زمانے میں
تری جفا کو بھی ناپائیدار دیکھا ہے

ترے قریب بھی ہے کش مکش وہی باقی
ترے حضور بھی دل بے قرار دیکھا ہے

ترے بغیر بھی کاٹے ہیں روز و شب آخر
ترے بغیر بھی عہدِ بہار دیکھا ہے

ترے تصوّرِ عالی کے خیر مقدم میں
ہر ایک چیز کو گردوں وقار دیکھا ہے

عُرُوسُ البلادُ

حلقہ بگوشِ گردشِ دوراں رہا ہُوں میں
آہنگِ انقلاب کا عنواں رہا ہُوں میں

کچھ اپنی سرگذشت کہی ہے برنگِ شعر!
کچھ آپ کے لیے بھی غزلخواں رہا ہُوں میں

اک حادثہ رہا ہے انیسِ دل و نظر
اک عُمر اُس کی یاد میں غلطاں رہا ہُوں میں

بے نام تہمتوں کو سمیٹا ہے بے دریغ
اُمیدوارِ رحمتِ یزداں رہا ہُوں میں

حق ہے مری وفا کا "زلیخائے شعر" پر
اس سلطنت میں یوسُفِ کنعاں رہا ہُوں میں

فطرت بھی اس خیال سے شاید نڈھال ہو
اتنا ترے بغیر پریشاں رہا ہُوں میں

شورشؔ گذشتہ رات عروسُ البلاد میں
اک جانِ نَو بہار کا مہماں رہا ہُوں میں

گاہے گاہے باز خواں

ساقی سبو اُٹھا کہ طبیعت اُداس ہے
مطرب غزل سُنا کہ طبیعت اُداس ہے

بادل کی کھڑکیوں سے ربعیہ کے رُوپ میں
اے چاند مُسکرا کہ طبیعت اُداس ہے

اے جانِ صد بہار، امینِ شمیم گُل!
اک بار لوٹ آ کہ طبیعت اُداس ہے

ہمجولیاں تمام ہیں لب تشنۂ سرود
آ اور غزل اُٹھا کہ طبیعت اُداس ہے

الھڑ جوانیوں کی شکایت سے فائدہ؟
فطرت پہ مُسکرا کہ طبیعت اُداس ہے

یہ رات اپنے گیسوئے شب تاب سے اُجال
یہ بات مان جا کہ طبیعت اُداس ہے

آؤ چلیں دیارِ ربعیہ کے آس پاس
یارانِ ہم نوا کہ طبیعت اُداس ہے

کہانی

دُور پنگھٹ پہ ستاروں کی جوانی لے کر
چند شاداب شگوفے پھُوٹے
رشکِ مہ تاب شگوفے پھُوٹے
اپنی رفتار میں لہروں کی روانی لے کر

پھُول تھے عصمت و عفّت کے سرِ راہگذار
چشمِ مے گوں میں شراب
ایک بے داغ شباب
نغمہ و شعر کے گوہر تھے کہ انمول شرار

اپنے آنچل کو سنبھالے ہوئے شرمائے ہوئے
ایک گمنام کہانی گذری
موسمِ گُل کی جوانی گذری
گاگریں سر پہ اُٹھائے ہوئے، بل کھائے ہوئے

آگ بھی آگ کہ تا حدِّ نظر پھیل گئی
اک گڈریے نے ترانہ چھیڑا
وقت کے ساتھ فسانہ چھیڑا
کھیت میں، باغ میں بے راہگذر پھیل گئی

سانیٹ

ربیعہ! کچھ تو آخر اہتمامِ زندگی کرلیں
زمانے کی ستم آرائیاں دیکھی نہیں جاتیں
عزیزوں کی کرم فرمائیاں دیکھی نہیں جاتیں
ربیعہ! اس سے بہتر ہے کہ دونوں خودکشی کرلیں

قضا کے روپ میں تکمیلِ شرحِ عاشقی کرلیں
ہمیں مہر و وفا کا آسمانی گیت گانا ہے
ہمیں اس زندگی کی سرحدوں سے دُور جانا ہے
ثریا سے تعارف، کہکشاں سے دوستی کرلیں

ستاروں سے ستاروں میں چلیں، افلاک تک پہنچیں
افق کے نیلگوں آنچل سے رعنائی چرا لائیں
مہ و خورشید کے چہرے کی برنائی چرا لائیں
ربیعہ! قدسیوں کے دامنِ بے چاک تک پہنچیں

عروسِ شعر سے موسیقی و آواز لے آئیں
ربیعہ! گُل کدوں سے کونپلوں کے ساز لے آئیں

تصویر

تصویر ہے کہ خندۂ لیل و نہار ہے

فطرت نے چاندنی کو سنوارا ہے اس طرح
سرو و سمن کا رنگ نکھارا ہے اس طرح

تصویر ہے کہ موجِ شمیمِ بہار ہے

آہنگِ شعر ہے کہ مصوّر کا خواب ہے

اک آرزو ہے شاعرِ فطرت نگار کی
اک دل کشا صدا ہے نسیمِ بہار کی

مہتاب کی جھلک ہے ستاروں کی آب ہے

فطرت کا آئینہ ہے حیا کے وُجُود میں
شبنم کا لوچ قامتِ شعر و سخن میں ہے
یُوناں کے بتکدوں کی نفاست بدن میں ہے
اک رُوحِ یاسمیں ہے صبا کے وُجُود میں

تصویر ہے کہ بادِ صبا کا نکھار ہے
کاغذ کے پیرہن میں نسیمِ بہار ہے

سات رنگ

جور و جفائے گردشِ دوراں اُٹھائیے
یارانِ نکتہ داں! کوئی طوفاں اُٹھائیے

لات و منات صدر نشینانِ بزم ہیں
اس بُت کدے سے کوئی تو انساں اُٹھائیے

نیرنگِ روزگار کی رُوداد چھیڑیئے
اربابِ انتظام کے احساں اُٹھائیے

یارانِ ہم سفر، گُل و لالہ سے درگذر
لازم ہے نازِ خارِ مغیلاں اُٹھائیے

رکھیے حدیثِ شعر میں بُنیادِ اجتہاد
ذرّوں سے آفتابِ درخشاں اُٹھائیے

بیتے دنوں کی خندہ جبینی کا واسطہ
اک بار تو نگاہِ پشیماں اُٹھائیے

شاخیں ہیں پائمال، شگوفے ہیں خستہ حال
شورش کچھ اور لذّتِ زنداں اُٹھائیے

کشمکش

آج کل شاخِ نشیمن سے خزاں گذرے ہے
زہر کھاتی ہُوئی ہونٹوں سے فغاں گذرے ہے

اس کشاکش میں یہاں عُمرِ رواں گُذرے ہے
جیسے صحرا سے کوئی تشنہ دہاں گذرے ہے

اس طرح دل میں گذرتی ہے خرابات کی یاد
جیسے شاخوں سے کوئی برقِ تپاں گذرے ہے

روح پر تلخیٔ ایّام سے پڑتی ہے خراش!
جیسے دُشنام عزیزوں پہ گراں گذرے ہے

اس طرح دوست دغا دے کے چلے جاتے ہیں
جیسے ہر سود کے رستے سے زیاں گذرے ہے

اس طرح سرد اُمیدوں کے دِیے جلتے ہیں
خواب سے جیسے کوئی کاہکشاں گذرے ہے

یُوں بھی پہنچے ہیں کچھ افسانے حقیقت کے قریب
جیسے کعبہ سے کوئی پیرِ مغاں گذرے ہے

اس طرح ذہن میں افکار اُمڈ پڑتے ہیں
جیسے اک قافلۂ زہرہ وشاں گذرے ہے

ہم گنہ گار جو اس سمت نکل جاتے ہیں!
ایک آواز سی آتی ہے فلاں گذرے ہے

موضوعِ سخن

میں نے پردیس میں یارانِ وطن ڈھونڈے ہیں
میں نے پُرہول بیاباں میں چمن ڈھونڈے ہیں
میں نے تاریک چٹانوں میں سمن ڈھونڈے ہیں
میں نے کچھ اور بھی موضوعِ سخن ڈھونڈے ہیں

اپنے حالات کی اُفتاد سے مجبور ہوں میں
شہرِ سلمٰی سے کہیں دُور بہت دُور ہوں میں
ایک آغاز کے انجام پہ مغرُور ہوں میں
میں نے کچھ اور بھی موضوعِ سخن ڈھونڈے ہیں

میں نے اس دَور کے اُسلوبِ سخن ڈھالے ہیں
میں نے صرصر کے تھپیڑوں میں چمن پالے ہیں
میں نے جذبات پہ لفظوں کے کفن ڈالے ہیں
میں نے کچھ اور بھی موضوعِ سخن ڈھونڈے ہیں

میں نے بے درد ربیعہ سے وفا مانگی ہے
میں نے کیا چیز بہ عنوانِ دعا مانگی ہے
یعنی آغازِ جوانی میں قضا مانگی ہے

میں نے کچھ اور بھی موضوعِ سخن ڈھونڈے ہیں

نغمۂ ساز کہاں ؟ تابشِ صمصام کہاں ؟
اَوجِ میخانہ کہاں ؟ دُردِ تہِ جام کہاں ؟
میں کہاں اور ربیعہ کے در و بام کہاں ؟

میں نے کچھ اور بھی موضوعِ سخن ڈھونڈے ہیں

میرا موضوعِ سخن ساقیٔ گلفام نہیں
نکہتِ زُلف نہیں، عشرتِ ایّام نہیں
اور اِس دل میں کوئی ولولۂ خام نہیں

میں نے کچھ اور بھی موضوعِ سخن ڈھونڈے ہیں

میرے لہجے کی چبھن آہِ شرربار میں ہے
میرا سرمایۂ فن، دعوتِ پیکار میں ہے
میرا اسلوبِ سخن، تیغ کی جھنکار میں ہے

میں نے کچھ اور بھی موضوعِ سخن ڈھونڈے ہیں

ناچ اے گوہرِ نایاب فضا رقص میں ہے
ناچ اے پیکرِ مہتاب وفا رقص میں ہے
ناچ اے نغمۂ شاداب ہوا رقص میں ہے
میں نے کچھ اور بھی موضوعِ سخن ڈھونڈے ہیں

جی میں آتا ہے عزیزوں کی حکایت لکھوں
اپنی محبوب ربعیہ کی شکایت لکھوں
اور لکھوں تو بعنوانِ محبّت لکھوں
میں نے کچھ اور بھی موضوعِ سخن ڈھونڈے ہیں

آج کی رات ربعیہ مجھے الزام نہ دے
زہر کا جام اُٹھا بادۂ گل فام نہ دے
جاں نثاری کا صلہ گردشِ ایّام نہ دے
میں نے کچھ اور بھی موضوعِ سخن ڈھونڈے ہیں

ذرا عمرِ رفتہ کو آواز دینا

ہم کہاں اور کہاں جلوۂ لیلائے غزل
کھینچ لاتے ہیں کہاں بادیہ پیمائے غزل
ایک رقاصہ بہ اسلوبِ صنم سازیِ عشق
ایک ہمرنگِ زمیں دامِ سراپائے غزل
ساز و آواز میں ڈھلتا ہُوا افسانۂ شب
زاویے رقص کے بُنتی ہُوئی مینائے غزل
لبِ لعلیں پہ کسی مطلعِ موزوں کا گماں،
مرمریں جسم ہمہ حُسنِ دلآرائے غزل
وقتِ گُفتار گُہر ہائے معانی کا نزُول
موجِ رفتار سے کِھلتے ہُوئے گُلہائے غزل

نشۂ شعر میں ڈوبی ہوئی لہجے کی کھنک
جیسے شمشیر کی آواز میں ڈھل جائے غزل
ایسا انداز کہ الفاظ میں غنچوں کی چٹک
ایسا اسلوب کہ ہر بول میں ایمائے غزل
موجِ گُل، موجِ صبا، موجِ غنا، موجِ شراب
ہے یہ سب سلسلۂ نقشِ کفِ پائے غزل
کاگ ہنستے ہوئے رندوں کی تہی دستی پر
جام در جام چھلکتی ہوئی صہبائے غزل
چاندنی شب میں سرِ جام و سبو یکجا ہیں
ہم نشینانِ ادب، بادیہ پیمائے غزل

گم ہو گئے

دوستداران وفا گم ہو گئے
وائے ارباب وفا گم ہو گئے

راستے پُر پیچ، راہی دل فگار
رہبروں کے نقش پا گم ہو گئے

رات کے تاریک سناٹوں کے ساتھ
مُطربانِ خوش نوا گم ہو گئے

ضربتِ امواج تیرا شکریہ
ناؤ ڈوبی ناخُدا گم ہو گئے

اوّل اوّل منزلیں اوجھل ہوئیں
آخر آخر رہنما گم ہو گئے

اب نہ نکہت ہے، نہ شبنم ہے، نہ رنگ
ہم صفیرانِ صبا گم ہو گئے

شیخ صاحب! ہمرہِ پیرِ مغاں
میکدے میں کیا ہُوا؟ گم ہو گئے

پڑ گئی مدھم حدی خوانوں کی لے
شہ سوارانِ وغا گم ہو گئے

خندۂ مہرِ درخشاں کی قسم
اس سحر کے آشنا گم ہو گئے

اب کہاں شعر و سخن کی رونقیں
شاعرِ شعلہ نوا گم ہو گئے

کل رات

بے مہر دوستوں کی دغا دیکھتا رہا
میں تھا کہ انقلاب وفا دیکھتا رہا

جلوہ طرازئ گُل و لالہ کے ساتھ ساتھ
سرو وسمن کی آب و ہوا دیکھتا رہا

چہروں کی چاندنی پہ سیہ گیسوؤں کا عکس
زہرہ وشوں کے ناز و ادا دیکھتا رہا

ناز و نیاز و قامتِ خوباں کے ہم رکاب
شرح و بیانِ زلفِ دوتا دیکھتا رہا

اک سیلِ نور رنگِ تغزّل میں موجزن
اک مہ جبیں کو نغمہ سرا دیکھتا رہا

ہونٹوں کی دل کشی پہ نواہائے دل پذیر
اور ان میں رنگ و بوئے حیا دیکھتا رہا

ہر ساقِ صندلیں میں نسیمِ سحر کا لوچ
ہر مرمریں بدن کی ضیا دیکھتا رہا

آنکھوں میں داستانِ شبینہ کے زمزمے
ہونٹوں پہ التہابِ دُعا دیکھتا رہا

ریشم کے پھُول زہرہ جبینوں کے رُوپ میں
شبنم کے پیرہن میں صبا دیکھتا رہا

شورؔش گذشتہ رات عروس البلاد میں
پیرِ مغاں کا رنگِ قبا دیکھتا رہا

انقلاب

ساقیہ سیم ساق و غیرتِ حُور
جام ہے اور فشُردۂ انگوُر

عزّتیں خاک، غیرتیں مجروح
رہنما خام، پیشوا ناسُور

عشق پامال، حُسن آوارہ
مُفلسی جُرم، بندگی بے نُور

آبگینوں پہ ضربِ سندانی
شیشہ ہائے نیاز چکنا چُور

خستہ حالوں کو ضبط کی تلقین
رہنماؤں میں آگہی نہ شعُور

کشتیاں زخم خوردۂ امواج
ناخداؤں کی نیّتوں میں فتوُر

بر سرِ دار خستگانِ وفا
پا بہ زنجیر بندگانِ جسُور

ہر طرف نعرہ ہائے رُستاخیز
ہر نفس انتظارِ یومِ نشور

ہز ہائی نس

کہاں ہو مُغبچو ! جاؤ شرابِ ناب لے آؤ
فلک کے میکدے سے ساغرِ مہتاب لے آؤ
اُٹھا لاؤ ہماری مملکت سے کوئی دوشیزہ
حضورِ ما بدولت گوہرِ شب تاب لے آؤ
غزل کا ساز چھیڑو حافظ و خیّام کی لَے ہیں
نظیؔری کے تغزُّل سے دُرِ خوش آب لے آؤ
شرابِ شعر چھڑکو چاندنی کے فرشِ نازک پر
عجم کی مہ وشوں کے یاسمینی خواب لے آؤ

طلائی فرش پہ عُریاں بدن زہرہ ادا ناچیں
اور اُن کے ریشمی جسموں سے رنگ و آب لے آؤ
فضاؤں کو بساؤ نکہتِ لب ہائے رنگیں سے
ہواؤں میں شمیمِ گیسوئے شب تاب لے آؤ

غزالوں کو اُٹھا لاؤ کہ یہ شب آنی جانی ہے
جوانی پھر کہاں؟ بس چار دن کی یہ جوانی ہے

• • •

سبُو حاضر ہے، مے حاضر ہے، خدمتگار حاضر ہیں
حضُور اس شب کدے میں پیکرِ انوار حاضر ہیں
کنیزانِ حرم قربان ہوں ظلِّ الٰہی پر
رعیّت کی یہ کنواری بیٹیاں سرکار حاضر ہیں
یہ شب ہے آتشہ ہے، رنگ ہے، آہنگ ہے، ضَو ہے
طرب کے ساز پر خیّام کے اشعار حاضر ہیں
برہنہ جسم سب بے عُذر ہیں قصرِ دل آرا میں
سہی قد نازنینوں کے لب و رُخسار حاضر ہیں

حجابِ رنگ و بُو میں ہے شمیمِ شعر و موسیقی
نقابِ لالہ و گُل میں دُرِ شہوار حاضر ہیں
اجازت ہو تو لب بستہ شگوفے بھی اُٹھا لائیں
حضُور ارشاد ہو! ہم غاشیہ بردار حاضر ہیں!

رعایا کو یقیں ہے آپ کی مُشکل کُشائی پر
خدا کا فضل ہے سرکار کی فرماں روائی پر

ہلالِ عید

وُہ دیکھتی ہے مہِ نَو کو مست آنکھوں سے
اُٹھے ہُوئے ہیں دُعاؤں کو ہاتھ سینے تک
یہ اک کسک ہے کہ پیوست ہوتی جاتی ہے
ہلالِ عید سے شاعر کے آبگینے تک

ہلالِ عید کی ضَو بار مسکراہٹ سے
حنائی ہاتھ سرِ بام لہلہائے ہیں
فضا کے دل میں ترازُو ہے تہنیت کا خروش
نظر سے تا بہ اُفق آنچلوں کے سائے ہیں

ہلالِ عید نہیں، آسماں کی دوشیزہ
تری نگاہوں سے چشمک چرانے آئی ہے
ترے شگفتہ لبوں کی دعائے نیم شبی
بساطِ خاک سے گردوں پہ مسکرائی ہے

اسے نہ دیکھ، اسے دیکھنے سے کیا حاصل!
تری شریر نگاہوں کی اس میں تاب نہیں
ترے جلالِ سحر تاب کا خروش کہاں؟
ترے جمالِ دل آویز کا جواب نہیں

مری ندیم محبت کے ان فسانوں کو
صدائے نعرۂ دار و رسن سے کیا نسبت؟
یہ سب درست، ترا عشق جبرِ فطرت ہے
ترے خیال کو لیکن وطن سے کیا نسبت؟

تری نگاہ نے جس کو ھلال سمجھا ہے

کہیں یہ نوحۂ قدرت کا کوئی بند نہ ہو
سوادِ ارض کے انساں کی بربریت پر
مری ندیم، فرشتوں کا زہر خند نہ ہو

ہلالِ عید کا شعلہ اُدھر بھڑکتا ہے
اِدھر ستاروں کی آنکھوں سے خوں ٹپکتا ہے
محل سراؤں میں شاہوں کا دل دھڑکتا ہے
وہ دیکھ! تاج پہ کوندا سا اک لپکتا ہے

مری ندیم یہی عید ہے غریبوں کو

مرے خُدا یہ کون ہیں؟

یہ خستہ حال قافلے، چمن لٹا کے آ گئے
فریب کھا کے آ گئے
یہ دِل گرفتہ کارواں، حرم گنوا کے آ گئے
مرے خدا یہ کون ہیں؟

یہ زخمیوں کے غول ہیں، غُبار سے اٹے ہُوئے
حیات سے کٹے ہُوئے
یہ ہڈّیوں کے خول ہیں بہ ایں ستم ڈٹے ہُوئے
مرے خدا یہ کون ہیں؟

یہ زرد رنگ کنواریاں، برہنہ سر برہنہ پا
قدم قدم پہ ابتلا
یہ تیرے شاہکار ہیں، مرے خدا مرے خدا
مرے خدا یہ کون ہیں؟

سُنا ہے ان پہ ایک برق بے اماں گذر گئی
رواں دواں گذر گئی
دل و جگر کو چیرتی ہُوئی سناں گذر گئی
مرے خدا یہ کون ہیں؟

حکیمِ مشرق

ابھی تو ہے بجلیوں کی زد میں ہر ایک طائر کا آشیانہ
ابھی تو ہے چہرۂ چمن پر خشونتِ گردشِ زمانہ
ابھی تو زنجیرِ پا کے حلقے، شکستِ زنداں کے منتظر ہیں
ابھی تو لیل و نہار کو ہے ضرورتِ ضربِ غازیانہ
ابھی تو دار و رسن پہ رہ رہ کے خونِ ناحق جھلک رہا ہے
ابھی تو یارانِ ہم سخن کے لیے مقدّر رہے قید خانہ
ابھی تو محلوں کے رہنے والے جلالِ یزداں سے بے خبر ہیں
ابھی تو جمہور کی جبینیں ہیں اور شاہوں کا آستانہ
ابھی تو حوّا کی بیٹیوں کا شباب بکتا ہے راستوں پر
ابھی تو زہرہ وشوں کی دوشیزگی ہے زیبِ شراب خانہ
عقیدت دل کے پھول لے کر چلا ہوں اقبال کی لحد پہ
کہ مرجعِ انقلابِ نو ہے، حکیمِ مشرق کا آستانہ
"مری اسیری پہ شاخِ گل نے یہ کہ کے صیّاد کو رلایا
کہ ایسے پرسوز نغمہ خواں کا گراں نہ تھا مجھ پہ آشیانہ"

ظفر علی خاں

مَیں اس گئے دَور میں بھی اک باکمال انساں کو دیکھتا ہوں
ذرا نظر سے کہو کہ ٹھہرے، ظفر علی خاں کو دیکھتا ہوں

خمیدہ قامت، علیل صحت، رہینِ رعشہ، ادائے رفتہ
ضعیف نظریں، شکستہ چہرہ، زباں ہیں لُکنت، صدائے رفتہ

ظفر علی خاں، ہماری تحریکِ حُریّت کا نشانِ آخر
فرنگیوں کا حریفِ اوّل، مُجاہدوں کی سنانِ آخر

ادیب ایسا کہ اس کے لہجے میں گُل کدوں کی کہانیاں تھیں
خطیب ایسا کہ اس کے پیرایۂ سخن میں جوانیاں تھیں

اسی گلستاں میں زندگی کی خزاں سے پہلے وہ کیا نہیں تھا
وہ بُلبُلِ خوشنوا نہیں تھا کہ ہم صفیرِ صبا نہیں تھا

اُٹھا تو ہر معرکہ میں برقِ تپاں سے کھیلا، قضا سے اُلجھا
بڑھا تو ہر مرحلہ میں تیغِ رواں سے کھیلا، دغا سے اُلجھا

یہ ماجرائے جہادِ ملّی کہ حرفِ تمت کا منتظر ہے
یہ ایک سمٹا ہُوا اُجالا ہے اور رحلت کا منتظر ہے

خطیبِ اعظم

سیّد عطاء اللہ شاہ بخاری

خطیبِ اعظم عرب کا نغمہ عجم کی لَے میں سُنا رہا ہے
سرِ چمن چہچہا رہا ہے، سرِ وغا مُسکرا رہا ہے

حدیثِ سرو و سمن نچھاور، زبانِ شمشیر اُس پہ قرباں!
مسیلمہ ایسے جعلسازوں کی بیخ و بُنیاد ڈھا رہا ہے

قرونِ اُولیٰ کی رزم گاہوں سے مُرتضےٰ کا جلال لے کر
دبیز نیندیں جھنجھوڑتا ہے، مجاہدوں کو جگا رہا ہے

ہیں اس کی للکار سے ہراساں محمدِ مصطفیٰ کے باغی
دغا کے جھنڈے گڑے ہوئے ہیں، غنیم پہ دندنا رہا ہے

ہیں اس کے چہرے کی مسکراہٹ سے ایسا محسوس کر رہا ہوں
کہ جیسے کوٹر پہ شام ہوتے کوئی دیا جھلملا رہا ہے

خدا فروشوں کی خانقاہوں پہ ایک بجلی سی کوندتی ہے
"ہوا ہے گو تُند و تیز لیکن چراغ اپنا جلا رہا ہے

وُہ مردِ درویش جس کو حق نے دیئے ہیں اندازِ خسروانہ"
اسی کی صُورت کو تک رہا ہے سفر سے ٹوٹا ہُوا زمانہ

دہلی سے واپسی پر

مہر و اخلاص کا پیغام لیے جاتا ہوں
یادِ احباب نکو نام لیے جاتا ہوں

کچھ حکایات سے ملتے ہیں کنایات مجھے
کچھ اشاراتِ در و بام لیے جاتا ہوں

اُن کے شعر امانت ہیں گھنی پلکوں کی
مُسکراتے ہُوئے کچھ جام لیے جاتا ہوں

دامنِ زہرہ جبیناں کی ہوا کے ہمراہ
نکہتِ گیسُوئے اصنام لیے جاتا ہُوں

تلخیٔ ماضیٔ مرحوم کا احساس غلط
مستیٔ بادۂ گُلفام لیے جاتا ہُوں

چند محبوب رفیقوں کی مُلاقات کے ساتھ
ایک آغازِ خوش انجام لیے جاتا ہُوں

پاسباں کون ہے روکے مرا رستہ آکر
رونقِ گردشِ ایام لیے جاتا ہُوں

بالِ جبریل کی جنبش ہے مرے خامے میں
شعر کے رُوپ میں الہام لیے جاتا ہُوں

آدرش بالا

۱

اِیشور کا آپ کے احوال پر انعام ہو
اچھّے بھیّا دیش آشا کا تمھیں پر نام ہو
آپ ہیں کس حال میں کوئی خبر لایا نہیں
ایک مُدّت ہو گئی، بھابی کا خط آیا نہیں
گا ہے گا ہے جی بھر آیا ہے فلک کی چال پر
بارہا آنسو نکل آئے ہیں ان احوال پر
انقلاب آیا پُرانے پیرہن بدلے گئے
وقت نے تیور بدل ڈالے، وطن بدلے گئے
پانچ دریاؤں کی وادی میں خلل آہی گیا
ہندو و مُسلم کی پیشانی پہ بل آہی گیا
ہم بچھڑ کر رہ گئے، اس کا ملال آتا بھی ہے؟
دیش آشا کا تمھیں بھیّا! خیال آتا بھی ہے؟

اپنے دل کا ہدیۂ اخلاص لا سکتی ہُوں میں؟
ہاں کہو بھیّا، تمھیں ملنے کو آسکتی ہُوں میں؟

آپ بھی حالات سے مجبور ہو کر رہ گئے
اپنی منہ بولی بہن سے دُور ہو کر رہ گئے

۲

شکریہ آدرشِ بالا کی دُعا کا شکریہ!
بھارتی ہمشیر کی مہر و وفا کا شکریہ!
اُس کے اس اخلاص کی دولت پہ مجھ کو ناز ہے
اُس کی اس آواز میں شامل مری آواز ہے
بیٹیاں ہر قوم کی صدق و صفا کے پھُول ہیں
ہم نشینِ ماہ و پرویں ہیں حیا کے پھُول ہیں
اُف خداوندا! اُنھیں آوارگی بخشی گئی
یومِ استقلال پر بے چارگی بخشی گئی

دُخترِ اسلام نانک کے پُجاری لے گئے
رام کے بیٹے سکینہ کی سواری لے گئے
سُورما اُٹھے، حیاؤں کو اُٹھا کر لے گئے
کچھ لُٹیرے عصمت سیتا چُرا کر لے گئے
حیف ایسے سُورماؤں کی کمینہ فوج پر
حیف اس اعلانِ آزادی کی خونیں موج پر

ستیہ اور شاہدہ میری نظر میں ایک ہیں
دو عقیدوں کے تصادم پر بھی دونوں نیک ہیں

آدرش بالا: پربودھ جی کی اہلیہ

دیش آشا: پربودھ جی کی بیٹی

ستیہ: لالہ پنڈی داس کی بیٹی

لالہ پنڈی داس: پنجاب کے معمر دیش بھگت، آدرش اور ستیہ کے پتا جی

مُطالبہ

اپنے مہتاب سے عارض کی حیا بیچو گی؟
اپنے یاقُوت سے ہونٹوں کی نوا بیچو گی؟
نُور سا گیسُوئے شب تاب سے پھیلاؤ گی
اپنے اُڑتے ہُوئے آنچل کی ہوا بیچو گی؟
چشمِ مے گوں سے لُٹاؤ گی مئے ہوش رُبا
مرمریں جسم کی اَنمول ادا بیچو گی؟
رات کے خُم میں اُنڈیلو گی تراِنوں کا لہُو
صُبحِ گلزار کی گُل گونہ قبا بیچو گی؟
اپنی راتوں کو اُجالو گی زر و سیم کے ساتھ
اپنی پلکوں کے ستاروں کی ضیا بیچو گی؟

اپنے لہجہ کی نفاست سے بکھیرو گی گلاب
اپنے بلّور سے ہاتھوں کی حنا بیچو گی؟
بسترِ شب پہ بچھاؤ گی سُنہری کلیاں!
صُبح کی ضَو میں جوانی کی حیا بیچو گی؟
رامش و رنگ کا ماحول صدا دیتا ہے
نکہتِ زُلف بہ عنوانِ صبا بیچو گی؟
وقت کے ساز پہ چھیڑو گی نواہائے جُنوں
دولت و زر کی ترازو میں وفا بیچو گی؟
روز بازار میں زردار چلے آتے ہیں
حُسن و غیرت کے خریدار چلے آتے ہیں

نگارانِ کراچی

میں اور کراچی کے نگارانِ دل آرام
اے وقت خدا کے لیے رُک اور مجھے تھام
دامن کشِ فطرت ہے غراروں کا دروبست
ہر سمت اڑے پھرتے ہیں خُوبانِ گُل اندام
رفتار کے انداز میں پرچم کی اُڑانیں
گُفتار کی جھنکار میں آوازۂ صمصام
باہوں کی ہر اک قوس میں اعجازِ تغزّل
انگڑائی کے ہر گھیر میں اک نغمۂ بے نام
یاقُوت سے ہونٹوں پہ سرورِ مئے حافظ
پلکوں کی گھنی چھاؤں میں خُمِ خانۂ خیّام

پیوست ہیں بالوں کی گُندھائی میں تارے
عارض کی گُلابی سے مہکتے ہیں در و بام
رُخسار پہ ناکردہ گناہوں کی حکایت
سینے میں دھڑکتا ہُوا، اک ولولۂ خام
نورنگ دوپٹوں کا ہواؤں سے تخاطُب
گلزارِ شفق زار میں سرگوشئ الہام
عشوے ہیں ستم ریز، تو نغمے ہیں بلا خیز
جذبات میں ہلچل ہے خیالات میں کہرام

ردِّعمل

یہ کون ناچ رہی ہے بلند کوٹھے پر
فضا میں تیر رہا ہے سرودِ چنگ و رباب
ہوا کے دوش پہ ہے گھنگھروؤں کی موسیقی
غزل کی لے میں گھُلے جا رہے ہیں شیب و شباب

اُڑاؤ کاگ کہ ہے محتسب بھی رندِ خراب
اُٹھاؤ جام مداوائے روزگار ہے یہ
قبائیں کھول دو، زُلفوں کو مُنتشر کر دو
بڑھاؤ ہاتھ، تقاضائے نوبہار ہے یہ

مُغنّیہ کی دُھنیں ہیں کہ کہکشاں کے خطُوط
یہ پھُول وُہ ہیں کہ شرمندۂ بہار نہیں
ہر ایک بول ہے دامن کشِ شکیب و قرار
شراب لاؤ کہ ہستی کا اعتبار نہیں

بنا رہی ہے کئی زاویے فضاؤں میں
نرت کے رُوپ میں تبدیل ہوتی جاتی ہے
گُداز جسم کی ہر قوس ایک نغمہ ہے
ہوا سرود میں تحلیل ہوتی جاتی ہے

صدائے منبر و محراب؟ اسے خدا کی پناہ
کہ اس سے نغمۂ چنگ و رباب بہتر ہے
حرم فروش فقیہوں کے حوضِ کوثر سے
مُغنّیہ کے لبوں کی شراب بہتر ہے

بھکارن

ارے تو کون ہے؟ کیا ڈھونڈتی پھرتی ہے راہوں میں
فقیرِ رہ نشیں ہے؟ یہ ترا کشکول خالی ہے
"خدا کے واسطے" کی چوٹ ہے لب ہائے نازک پر
اِدھر بھرپور جبیں ہیں، اُدھر دستِ سوالی ہے

ٹھہر چشمِ تماشا! دیکھ اس حوّا کی بیٹی کو
کہ اس کے حال پر بے درد راہی مسکراتے ہیں
لرزتے آنسوؤں کا ٹمٹماتی آنکھوں میں پانی ہے
گھنی پلکوں میں ناگفتہ فسانے تلملاتے ہیں

تراشا ہے اُسے بھی صانعِ قدرت کے ہاتھوں نے
اسے بھی دو دلوں کی باہمی اُلفت نے ڈھالا ہے
کوئی تو اس چراغِ رہگذر کا بھی خدا ہوگا
اسے بھی غالباً ماں باپ کی شفقت نے پالا ہے

عجب کیا ہے، فلاں ابنِ فلاں کی مہربانی سے
گدائی مرحلوں کے بعد "اُس بازار" میں پہنچے
بہ ایں حالِ زبُوں عصمت کی تابانی گنوا بیٹھے
غریبی بیچ دے اور پہلوئے زردار میں پہنچے

خدا کے نام پر بازار میں کوڑی نہیں ملتی !
ہوس کی چاشنی سے دل کا کاروبار چلتا ہے
گلُابی ہونٹ اک جنسِ گرانمایہ ہیں منڈی میں
انھیں اجسام سے یہ حُسن کا بازار چلتا ہے

درویشِ بے گلیم

اک ابرِ نوبہار فضاؤں پہ چھا گیا
اقبالؔ اس چمن کی رگوں میں سما گیا
دل کا خروش، عشق کا شعلہ، نظر کی آگ
اپنے قلم کی گرم نوا سے بڑھا گیا
اس کی صدا تھی صورِ سرافیل کا جواب
اس کا خروش ہر کرہ و مہ کو جگا گیا
اقصائے چیں سے تابہ سوادِ طرابلس
جلوہ گہِ حیات کے پردے اُٹھا گیا
وہ چند ہیں ادب کی نواہائے تابدار
شعر و سخن کے نام سے موتی لُٹا گیا

کشمیر کی بہشت کا درویشِ بے گلیم
بطحا کی وادیوں کے ترانے سُنا گیا
رُومی کے سوز و ساز کی دولت سے بہرہ یاب
فطرت کے پیچ و خم سے نقابیں اُٹھا گیا
ضربِ کلیم اس کی نواؤں کا ماحصل
وُہ یُوں اُٹھا کہ مشرق و مغرب پہ چھا گیا
ہر رہ نما کو منزلِ عرفاں کی دی خبر
ہر راہرو کو جادۂ ایماں بتا گیا
شورشؔ مرے قلم کو دیا اذنِ انقلاب
اور خواجگانِ دہر سے لڑنا سکھا گیا

شالامار

آج سے دو سو برس پہلے جو شالامار تھا
چشمِ شاعر کے لیے اک مطلعِ انوار تھا
تختۂ اوّل کے پیڑوں کی گھنیری چھاؤں میں
نازنینانِ شہی کا حُسن نکہت بار تھا
تختۂ ثانی کی رنگا رنگ آرایش کے ساتھ
تختۂ ثالث کا ہر ذرّہ دُرِ شہوار تھا
ڈھل رہے تھے غنچہ و گُل میں نقوشِ پائے ناز
بُرجیوں میں التہابِ سینہ و رُخسار تھا
مخملیں سبزے سے لے کر چاندنی کے فرش تک
ہر طرف پھیلا ہُوا افسونِ بے زنہار تھا
شاہزادوں کے جلَو میں تھیں زلیخا زادیاں
سایۂ سرو و صنوبر مصر کا بازار تھا
لیکن اب تاریخ کا سینہ سراسر داغ ہے
بادشاہوں کا گلستاں، منچلوں کا باغ ہے

ایک کہانی

ایک دہقاں کی دخترِ مجبور
اپنی عِصمت پہ چوٹ کھائے ہوئے
ایک فریاد بن کے بیٹھی ہے
اپنے زانو پہ سر جھکائے ہوئے

ملگجے رنگ کے دوپٹے پر
بے صدا آنسوؤں کا پانی ہے
نکہت و نُور کی رداؤں میں
ایک سِمٹی ہُوئی جوانی ہے

چند بے نام سی ملاقاتیں
پھیلتی جا رہی ہیں گاؤں میں
لغزشِ پا کی داستانیں ہیں
شاخساروں کی ٹھنڈی چھاؤں میں

نوجوانی کی لغزشوں کا غبار کھیلتا ہے سپید گالوں سے
ان کہی داستاں چھلکتی ہے دو چھلکتے ہُوئے پیالوں سے

ہاں! ٹھہر انقلابِ لیل و نہار مرقدِ شعر کے چراغ کو دیکھ
دیکھ اس نکہتِ پریدہ کو ایک چھلکے ہُوئے ایاغ کو دیکھ

ان غزالوں کا غازۂ عصمت شب کے عارض سنوارتا ہی رہا
اور خداوند کی مشیّت کو اُن کا نوحہ پُکارتا ہی رہا

کراچی

ہر روش اک جال ہے، ہر رہگذر اک دام ہے
شہر کیا ہے؟ ضابطے کے پیچ و خم کا نام ہے

رہنما گم کردہ رہ ہیں، راہرو ناچار و شل
دوستی اک حرفِ رُسوا ہے، وفا بدنام ہے

حاکمانِ وقت سے مفقود ہے خوفِ خُدا
شہر کا ہر ایک گوشہ فارغ از اسلام ہے

نُور و نکہت کی فراوانی ہے تا حدِّ نظر
شعر و نغمہ کی جوانی کا تموّج عام ہے

دُور تک پھیلے ہوُئے محلوں کی رفعت کا شکوہ
یہ بتاتا ہے، قریب اک دَورِ خوں آشام ہے

الغرض محسوس ہوتا ہے کراچی میں مجُھے!
شہر کیا ہے؟ شہریّت کے نام پر الزام ہے

کلفٹن

آج تنہا ہوں کلفٹن پہ چلا آیا ہوں
لالہ رُخ، شُعلہ بدن، عام نظر آتے ہیں
چاندنی بحر کی موجوں میں گھُلی جاتی ہے
نغمہ و شعر بہر گام نظر آتے ہیں
نظر افروز ہیں ہر سمت گھنیری زُلفیں
طائرِ دل کے لیے دام نظر آتے ہیں
اہلِ ایماں کی جبینیں بھی جھُکی جاتی ہیں
ایسے اس دیر میں اصنام نظر آتے ہیں

جب حسینوں کے دوپٹوں سے ہوا کھیلتی ہے
مہر و مہتاب لبِ بام نظر آتے ہیں
مُسکراتے ہُوئے چہروں سے حیا نادم ہے
جگمگاتے ہُوئے اجسام نظر آتے ہیں
گیت کی لَے میں مغنّی کا لہُو رقصاں ہے
شعر کے رُوپ میں الہام نظر آتے ہیں
چشمِ بد دُور غزل ہائے رواں دیکھتا ہوں
انکھڑیاں ہیں کہ مے و جام نظر آتے ہیں

تہدیہ

اس دورِ پُرخطر کی ہواؤں پہ غور کر
یارانِ سُست رَو کی اداؤں پہ غور کر
تاریخِ انقلابِ اُمم پر نگاہ ڈال
دُکھے ہُوئے دلوں کی دُعاؤں پہ غور کر
سرو وسمن کے چہرۂ خونیں کا واسطہ
سرو وسمن کی چاک رداؤں پہ غور کر
کُملا چُکے ہیں پھُول صبا کے فریب سے
ناساز کونپلوں کی نواؤں پہ غور کر
کچھ سوچ انقلابِ زمانہ کا سدِّ باب
کچھ اپنے دوستوں کی وفاؤں پہ غور کر
اپنے خدا سے مانگ ابُوذر رضؓ کا انکسار!
دربارِ مصطفیٰؐ کے گداؤں پہ غور کر
میں جانتا ہوں تیری نگاہوں کا منتہیٰ
لیکن مرے قلم کی صداؤں پہ غور کر

ۓ عبدالرب نشتر کے نام

گُل برگ

ہر سزا سے ماورئی ہر خوف سے آزاد ہے
اک صنم خانہ بہ اندازِ حرم آباد ہے
داستاں در داستاں ہیں راستوں کے پیچ و خم
رنگ و بُو کے پیرہن میں جنّتِ شدّاد ہے
سیم و زر کے اَن کہے قصّوں کی ارزانی کے ساتھ
ذرّہ ذرّہ اختیارِ خاص کی رُوداد ہے
سنگِ مرمر کے سُہانے خواب ہیں صُورت پذیر
ہر روش اک شاہکار مانی و بہزاد ہے
اس کی رفعت ہے ہماری ہڈّیوں سے استوار
اس کی شریانوں میں خونِ شہ رگِ فرہاد ہے
حاصلِ محنت سے ہے اس گل کدے کی آب و تاب
بے نواؤں کا لہُو اِن کوٹھیوں کی کھاد ہے
دوستو! سلطانی جمہور کے آئین میں
ہم غریبوں کے لیے آنسو ہیں اور فریاد ہے

تُربتِ اقبالؒ

چُھپ ہے تری آغوش میں اک پیرِ کہن سال
جبریل کے بازو سے لیے جس نے پر و بال
اے تُربتِ اقبال

تو خواب گہِ شاعرِ تسلیم و رضا ہے
یہ خاک تری مہبطِ انوارِ خدا ہے
اے تُربتِ اقبال

اک مردِ قلندر کی نوا جھوم رہی ہے
رحمت ترے ذرّوں کی جبیں چوم رہی ہے
اے تُربتِ اقبال

قائم ہیں غلامانہ روایات ابھی تک
بدلے نہیں اس دَور کے حالات ابھی تک
اے تُربتِ اقبال

کانٹوں میں شفق فام بہاروں کا لہو ہے
خورشید کے ساغر میں ستاروں کا لہو ہے
اے تُربتِ اقبال

بے رنگ ہے افسانۂ ایام ابھی تک　　اس مُلک میں مجبور رہے اسلام ابھی تک

اے تُربتِ اقبال

مُلّا سرِ بازار خدا بیچ رہے ہیں　　اسلام کے چہرے کی ضیا بیچ رہے ہیں

اے تُربتِ اقبال

اے تُربتِ اقبال سکوں ڈھونڈ رہا ہوں　　میں شرحِ نواہائے جنوں ڈھونڈ رہا ہوں

اے تُربتِ اقبال

"اُس دَور میں مے اَور ہے جام اور ہے جم اَور"　　ساقی نے بِنا کی روشِ لطف و کرم اَور

اے تُربتِ اقبال

عید آئی ہے

کملا بولی یہ سکینہ سے کہ "عید آئی ہے"
سُن کے یہ رُوئے سکینہ پہ ملال آ ہی گیا
ایک گم گشتہ زمانے کی خلش جاگ اٹھی
اپنے ماں باپ کی شفقت کا خیال آ ہی گیا

اور اس سوچ میں پلکوں سے ستارے ٹپکے
کیا ہُوا یہ، مرے گھر بار پہ کیا گذری ہے
مری ہمشیرِ نعیمہ کی خبر آئی نہیں!
میری اُمّی کے دلِ زار پہ کیا گذری ہے

دُور کیکر کے درختوں کی گھنی شاخوں میں
عید کا چاند خلاؤں میں کہیں ڈوب گیا
ایک فریاد مشیّت سے گِلہ مند ہُوئی
ایک احساس دُعاؤں میں کہیں ڈوب گیا

لڑکھڑاتا ہُوا جسونت چلا آتا ہے!
مسخِ فطرت کے گنہ گار ارادے لے کر
ٹھیٹھ لہجے میں سکینہ کو پکارا اُس نے
نشّے کی رَو میں سیہ کار ارادے لے کر

کل وُہ اِک پارۂ عصمت تھی اسی بستی میں
آج بازیچۂ عشرت کے سوا کچھ بھی نہیں
اس پہ جو بیت گئی بیت رہی ہے اب تک
رہنماؤں کی سیاست کے سوا کچھ بھی نہیں

کملا بولی یہ سکینہ سے کہ "عید آئی ہے"
سُن کے یہ رُوئے سکینہ پہ ملال آہی گیا

سہیلیوں کی عید

سہیلیوں کے نغمہ ہائے دل کشا چہک اُٹھے
ہوائے نوبہار سے سمن کدے مہک اُٹھے

سہیلیوں کی عید ہے

سہیلیوں کی عید ہے کہ خندۂ بہار ہے
ہر اک جبیں سے اضطراب شوق آشکار ہے

سہیلیوں کی عید ہے

بکھر رہی ہیں کاکلیں سحر کے انتظار میں
کھلے ہوئے ہیں یاسمیں کے پھول لالہ زار میں

سہیلیوں کی عید ہے

سہیلیوں کا غول ہے کہ بتکدے کی شام ہے
وفورِ رنگ و نور ہے کہ جلوہ گاہِ عام ہے
سہیلیوں کی عید ہے

چراغ وادیٔ نظر، جبینِ مہر و ماہ ہے
غبارِ کہکشاں کا نام گردِ شاہراہ ہے
سہیلیوں کی عید ہے

وُہ اک اُداس مغویہ کہ پیکرِ ہلال ہے
ضعیف ماں کی سوگوار یاد میں نڈھال ہے
سہیلیوں کی عید ہے

خدا کرے کہ حادثوں کے قہر سے بچی رہیں
یہ ہرنیاں شکاریوں کے زہر سے بچی رہیں
سہیلیوں کی عید ہے

تصویریں

شاہی مسجد

جھلک رہا ہے جبینوں سے رنگ و نورِ ہلال ؑ
فضا کے دل میں ترازو ہیں نعرہ ہائے جلال

دُعا کو ہاتھ اُٹھے ہیں فضا شگفتہ ہے
بہار عطر فشاں ہے، صبا شگفتہ ہے

کلامِ پاک کی تاثیر ہے فضاؤں میں
خروشِ نعرۂ تکبیر ہے فضاؤں میں!

یہ راز مصحفِ فطرت سے آشکارا ہے
صلوٰۃ کیا ہے؟ مسلماں کا اک سہارا ہے

شاہی قلعہ

عروج دیکھا ہے ان کا زوال دیکھا ہے
شہنشہوں کا جمال و جلال دیکھا ہے

نصیب ڈوبتے دیکھے ہیں شہسواروں کے
رقیب کانپتے دیکھے ہیں تاجداروں کے

کمالِ ہمہمۂ روزگار بیت گیا
یہ ایک دور تھا پایانِ کار بیت گیا

زمانہ زُلفِ تغیر سنوارتا ہی رہا
قضا کا ہاتھ حنا کو نکھارتا ہی رہا

اقبالؒ کا مزار

دُعا کو ہاتھ اٹھاؤں تو راز کُھلتا ہے
ہر ایک ذرّہ یہاں رحمتوں میں تُلتا ہے
فقیر آتے ہیں، گردوں رکاب آتے ہیں
اس آستاں پہ جلالت مآب آتے ہیں
کلیمِ وقت کی تربت سے آشکار ہے یہ
خودی کا سرِّ نہاں! وقت کی پکار ہے یہ
نہ تخت و تاج میں نے لشکر و سپاہ میں ہے
جو بات مردِ قلندر کی بارگاہ میں ہے

سکندر حیات کا مزار

ٹھہر بھی چشمِ تماشا مقامِ عبرت ہے
ہر ایک ذرّۂ خاکی پیامِ عبرت ہے
یہ بے ثبات زمانے بدلتے رہتے ہیں
وزارتوں کے ٹھکانے بدلتے رہتے ہیں
حضوری باغ میں اک خاکسار گاتا ہے
عجیب درد ہواؤں میں سرسراتا ہے
ہر اقتدار کے لیل و نہار فانی ہیں
یہ جاہ و منصب و عزّ و وقار فانی ہیں

مسجد و مینار

سوچتا ہے ذہنِ شاعر وقت کی تحریر پر — خواب کی ٹھہری ہیں حیرت خانۂ تصویر پر
ناکشودہ ہیں ابھی تک عقدہ ہائے مرگ و زیست — عقلِ انساں دنگ ہے، نیرنگیٔ تقدیر پر
چیستاں ہیں روز و شب کے حلقہ ہائے نَو بنَو — گنگ ہے فطرت کتابِ دہر کی تفسیر پر
ہے طلوعِ شمس کے پردے میں شب کا آب و رنگ — مشعلِ تخریب کا پرتَو ہے ہر تعمیر پر

زندگی فطرت کے ہاتھوں میں شکستہ ساز ہے
موت کے سُنسان ویرانے میں اک آواز ہے

مسجدِ شاہی کے میناروں کی رفعت کا شکوہ — مہبطِ انوارِ یزداں ہے سراپا نُور ہے
اس کی دیواروں پہ کندہ ہے سپاسِ ذوالجلال — اس کے بام و در پہ نُور افشاں چراغِ طُور ہے
لیکن اس سے دس قدم پر جاگتی راتوں کا شہر — عارض و گیسو کی صنعت کے لیے مشہُور ہے

بادۂ لعلیں سے ہے لبریز جامِ زرنگار
ہر کہ و مہ نشۂ حرص و ہوا میں چُور ہے

عورتیں نیلام کرتی ہیں بکثرت عصمتیں
حُسن خود اپنے لیے رستا ہُوا ناسُور ہے

ٹوٹتی ہیں رات کی نبضیں اذاں کی ضرب سے
پائلوں کی چھن چھنا چھن سے فضا معمُور ہے

اس فضا کا ذرّہ ذرّہ معصیت بر دوش ہے
آدمی محسوس کرتا ہے، خُدا خاموش ہے

عید کا دن اور عورت کی حیا نیلام ہو؟
ہم جمالانِ زلیخا کی وفا نیلام ہو؟

عارضِ گلگوں پہ ہو تضحیک کا گرد و غبار
لالہ و گُل کے لبادے میں حیا نیلام ہو؟

اک طرف زہرہ بدن انگڑائیاں لے کر اٹھیں
اک طرف صُوفی و مُلّا کی قبا نیلام ہو؟

زاویے بُنتی رہے رقاصۂ زہرہ جبیں
غنچہ ہائے نو شگفتہ کی صدا نیلام ہو؟

اس طرف ہو مسجدِ شاہی میں بانگِ "لاتخف"
اس طرف بازار میں خوفِ خدا نیلام ہو؟

اشہبِ تاریخ کو حاجت ہے پھر مہمیز کی
بُزدلوں کو پھر ضرورت ہے کسی چنگیز کی

داتا تری نگری میں

مُلّا بھی ہیں قاری بھی — نوری بھی ہیں ناری بھی
مقہور بھکاری بھی — عیّاش پُجاری بھی

داتا —— تری نگری میں

ناموسِ وفا غائب — دامانِ حیا غائب
تقدیسِ حرم رُسوا — تسلیم و رضا غائب

داتا —— تری نگری میں

دن رات دعائیں ہیں — ہُو حق کی صدائیں ہیں
شب تاب ہیں عمامے — پُر پیچ قبائیں ہیں

داتا —— تری نگری میں

شُعلے کی اڑانیں ہیں — شُعلوں کی زبانیں ہیں
دلچسپ اندھیرے ہیں — پُر نُور —— دُکانیں ہیں

داتا —— تری نگری میں

پہرے ہیں فضاؤں پر قدغن ہے بیانوں پر
تادیب کی مُہریں ہیں دو ٹوک زبانوں پر

داتا —— تری نگری میں

مسحورِ زن و مے ہیں ہم مرتبۂ کَے ہیں
پیرانِ ریا مشرب دیکھو تو بڑی شے ہیں

داتا —— تری نگری میں

ریشم کی عباؤں میں رہزن ہیں لٹیرے ہیں
موروثی گداؤں میں تیرے ہیں نہ میرے ہیں

داتا —— تری نگری میں

ابوالکلام آزاد

عشق میں رُومی، فکر میں رازی، عزم کا منبع، جہد کا حاصل
حسنِ عمل کا گوہرِ یکتا، علم و فطانت کا مجموعۂ کامل

اُس کی روش سے گردشِ دوراں اپنے کیے پر آپ پشیماں
اُس کی صدا سے سربگریباں شورشِ گیتی، لشکرِ باطل

اُس کے قلم کی جنبشِ ادنیٰ لولوئے لالہ ڈھال چکی ہے
اُس کی نظر تجدید کی خوگر، اُس کا چلن تقلید کے قابل

اُس کی فصاحت معدنِ شعری، اُس کی بلاغت مصدرِ معنی
اُس کی نفاست گلشن گلشن، اُس کی لطافت محفل محفل

اُس کی روانی گنگ و جمن میں، اُس کی کہانی دار و رسن میں
اُس کی سیادت جادہ جادہ، اُس کی قیادت منزل منزل

اُس کے ادب میں بانگِ جرس ہے، بانگِ جرس میں جوشِ جنوں ہے
جوشِ جنوں میں سوزِ دروں ہے، سوزِ دروں میں جذبۂ شامل

اُس کی جبیں پر شکنیں ہی شکنیں لب بستہ غنچوں کی صورت
اہلِ چمن سے پوچھ رہی ہیں، آخر ان خدمات کا حاصل؟

بُت خانے کے طاق میں شورشؔ شمعِ حرم کو دیکھ رہا ہوں
صحنِ چمن میں شام کو جیسے دورِ خزاں میں شورِ عنادل

ساقی

ہر ایک جام میں ماہِ تمام ہے ساقی
اُٹھا سبُو، کہ یہاں اذنِ عام ہے ساقی

خراب حال خرد کو سنوارنے کے لیے
عجیب چیز مئے لالہ فام ہے ساقی

یہ کیا غضب ہے کہ اس دورِ نامبارک میں
لہُو حلال ہے اور مے حرام ہے ساقی

بہت دنوں سے حرم کے چراغ مدّھم ہیں
فقیہِ شہر بُتوں کا غلام ہے ساقی

یہ میکدے سے ادھر زیرکوں کی مجلس میں
ہر ایک بات خلاف عوام ہے ساقی

سفید ریش بزرگوں کی پارسائی میں
فقیرِ گوشہ نشیں کو کلام ہے ساقی

حکیمِ شرق کہ اقبال نام ہے اس کا
ہر ایک پیر و جواں کا امام ہے ساقی

غزل

فغاں رُک گئی ہے نوا تھک چُکی ہے
حضورِ خدا ہر دُعا تھک چکی ہے

کئی زمزمے جاگ کر سو چکے ہیں
کئی جنگلوں میں ہوا تھک چُکی ہے

نوا ہائے معنی کی آہٹ ہے مدّھم
عروسِ ادب کی حیا تھک چکی ہے

اُدھر شُعلۂ حسن کجلا گیا ہے
اِدھر چل کے شب بھر صبا تھک چکی ہے

نئے دَور کی اُلجھنیں کہ رہی ہیں
کہ اب رُوحِ ارض و سما تھک چکی ہے

لہک سو گئی ہے مہک کھو گئی ہے
چمن لُٹ گئے ہیں صبا تھک چکی ہے

ادھر قافلے راستے کھو چکے ہیں
ادھر ہمّتِ رہنما تھک چکی ہے

جاگیردار

ابے کلن — ! وہ لڑکی کون ہے برگد کی چھاؤں میں

زبیدہ ہے — ؟ اسی کے حسن کا چرچا ہے گاؤں میں

زبیدہ — ؟ ٹھیک ، اُس نُورا بہشتی کی نواسی ہے

اجی سرکار والا ! آپ کے چرنوں کی داسی ہے

اجازت ہو تو دن چھپتے ہی ڈیرے پر بلُا لاؤں

بھلا انکار اور وُہ ، رات کو گھر سے اُٹھا لاؤں

ارے توبہ جوانی ، ہیچ اور رنگ جم دکے ہے

یہ چودہ سال کے پیٹے میں ہے لیکن بڑی شے ہے

صبا کا لوچ ہے آوازۂ شمشیر ہے شاید

ہمارے گاؤں میں اک جانشین ہیر ہے شاید

بہشتی کو ابھی حاضر کرو ، دربار میں لاؤ
زبیدہ کو سرِ شام آج ہی سرکار میں لاؤ
میں اس کے چمپئی چہرے کی زیبائی سے کھیلوں گا
میں اس کی کُندنی بانہوں کی رعنائی سے کھیلوں گا
میں ہوں جاگیر کا مالک مجھے سردار کہتے ہیں
مجھے اس گاؤں کے خورد و کلاں سرکار کہتے ہیں
مری بستی کی دہقاں زادیوں کا حُسن بالا ہے
انھیں میرے تعیُّش کے لیے فطرت نے پالا ہے

عید آ رہی ہے

(مغویہ کے تاثرات)

فضاؤں پر اداسی چھا رہی ہے
عزیزوں کی خلش تڑپا رہی ہے
ہجوم یاس سے گھبرا رہی ہے
سکینہ آہ بنتی جا رہی ہے
پرائے دیس میں عید آ رہی ہے

مہ و خورشید کی تابانیوں میں
شفق کی سُرمگیں پیشانیوں میں
سکینہ کی الم سامانیوں میں
عجب شے ہے کہ گھُلتی جا رہی ہے
پرائے دیس میں عید آ رہی ہے

کبھی خوش تھی مگر رنجور ہے اب
پرائے دیس میں مجبور ہے اب
سکینہ نالۂ مہجور ہے اب
یہ اک نو رس کلی مرجھا رہی ہے
پرائے دیس میں عید آ رہی ہے

ہوائیں گیت بنتی جا رہی ہیں
افق پہ ناگنیں لہرا رہی ہیں
اسے ہمجولیاں یاد آ رہی ہیں
ستاروں کی لوئیں تھرّا رہی ہیں
پرائے دیس میں عید آ رہی ہے

اسی گاؤں میں اک شہکار تھی یہ　　مثالِ نیّرِ ضو بار تھی یہ
حریفِ سبحہ و زنّار تھی یہ　　مگر اب خاک ہوتی جا رہی ہے
پرائے دیس میں عید آ رہی ہے

ثبوت اس بات کا اس حال سے ہے　　یہ ظاہر اس کے خد و خال سے ہے
پرائے دیس میں چھ سال سے ہے　　یہ کونپل دم بدم مرجھا رہی ہے
پرائے دیس میں عید آ رہی ہے

سراسر غنچۂ معصوم ہے یہ　　غموں سے چُور ہے مغموم ہے یہ
پرائے دیس میں مظلوم ہے یہ　　برہ کے گیت گائے جا رہی ہے
پرائے دیس میں عید آ رہی ہے

کبھی ماں باپ کا نورِ نظر تھی　　شعاعِ مہر تھی رنگِ سحر تھی
جہاں تھی ہر طرح سے معتبر تھی　　مگر اب مغویہ کہلا رہی ہے
پرائے دیس میں عید آ رہی ہے

زمانہ کیا سماں دکھلا رہا ہے　　دلِ کون و مکاں تھرّا رہا ہے
خدا کا خوف اُٹھتا جا رہا ہے　　فضا میں آگ لگتی جا رہی ہے
پرائے دیس میں عید آ رہی ہے

گوالے

گوالے گیت بُنتے آ رہے ہیں
رسیلے بول ہیں، لہرا رہے ہیں
——— گوالے گا رہے ہیں

قبائے لالہ و گُل ارغواں ہے
فضا کا ذرّہ ذرّہ ہم زباں ہے
——— گوالے گا رہے ہیں

عزیزوں کی کہانی سُن رہا ہوں
گوالوں کی زبانی سُن رہا ہوں
——— گوالے گا رہے ہیں

فسانہ ہائے ناموسِ وفا ہیں
دُھنوں میں نغمہ ہائے دلکشا ہیں
——— گوالے گا رہے ہیں

عجب تانیں فضا میں جھومتی ہیں
صبا کے دامنوں کو چومتی ہیں

——— گوالے گا رہے ہیں

ستاروں کی چمک آواز میں ہے
کوئی بے نام جذبہ ساز میں ہے

——— گوالے گا رہے ہیں

گوالوں کی دُھنوں میں کیا فسوں ہے
پسِ پردہ کوئی صیدِ زبوں ہے

——— گوالے گا رہے ہیں

قمار خانہ

بکھرے بکھرے تاش کے پتّے چند جواری کھیل رہے ہیں
فکر میں ہر اک ڈوب رہا ہے، باری باری کھیل رہے ہیں
حکم کی دُگّی، اینٹ کا دہلا، چشم زدن میں جیت گئی ہے
سکّوں کی جھنکار کے بل پر رات اندھیری بیت گئی ہے
خواجہ کی دستار کا سلمہ ایرے غیرے لُوٹ رہے ہیں،
کلیوں کے منہ زرد پڑے ہیں سرو کے پرچم ٹوٹ رہے ہیں
داؤں پہ ہے ہر ایک کھلاڑی ترساں ترساں لرزاں لرزاں
جیتنے والے خنداں خنداں، ہارنے والے حیراں حیراں،
یہ مارا وہ پانسہ پلٹا، یہ جیتے وہ ہار رہے ہیں،
حکم اور اینٹ کی ٹرپ نہیں ہے پھُول کے پتّے مار رہے ہیں
جیتو ہارو، ہارو جیتو، اس ڈیرے کی ریت یہی ہے
اس سے چھینو، اس پر جھپٹو، میت کے بھُو کو میت یہی ہے
دُھوپ چڑھی آتی ہے سروں پر کھیلنے والے لوٹ چکے ہیں،
سُرخ ہیں اب سونے کی چٹانیں خون کے چشمے پھُوٹ چکے ہیں

فقیہِ شہر

مری حقیر جسارت نے بادہ خانے میں
فقیہِ شہر کو کل رات لاجواب کیا

حضور آپ اور اس میکدے کی چوکھٹ پر
حضور آپ نے ذرّوں کو آفتاب کیا

بہ ایں لباس درِ میکدہ تک آ پہنچے،
بہ ایں قبا مے و مینا کو انتخاب کیا

سفید ریش کی اس طرح آبرو رکھّی
کہ خونِ مے سے ہر اک بال کو خضاب کیا

خدا کے فضل سے حوروں کے ڈارلنگ ٹھہرے
اس آرزو میں جوانی کو فیض یاب کیا

صبا کے رُوپ میں صرصر سے دوستی گانٹھی
ہوس کی اوٹ میں چہرے کو بے نقاب کیا
سوادِ شب میں حسینوں سے شاد کام ہُوئے
سحر ہُوئی تو زمانے کا احتساب کیا
ہر اک ثواب بہ عنوانِ آخرت چھوڑا
ہر اک گناہ بہ اندازِ اجتناب کیا
فقیہِ شہر نے یہ گفتگو سُنی تو کہا
جو کام ہم نے کیا از رہِ ثواب کیا

مغل شہزادے

سازشیں عام تھیں حالات پراگندہ تھے
شاہ زادوں کے خیالات پراگندہ تھے

اپنے ہی ہاتھوں سے اپنوں کے گلے کٹتے تھے
لوگ بھی تاش کے پتّوں کی طرح بٹتے تھے

شہ سواروں میں شجاعت کا کہیں نام نہ تھا
کج کلاہوں کو رعیّت سے کوئی کام نہ تھا

جال ہی جال تھے پھیلے ہوئے غدّاری کے
اہلِ دربار ہی سرخیل تھے مکّاری کے

رات بے داغ اُجالے کو نگلتی ہی رہی
سلطنت برف کے مانند پگھلتی ہی رہی

داغ ہی داغ ہیں تاریخِ جہانبانی پر
آج کچھ بل ہیں مگر وقت کی پیشانی پر

خدا کی پناہ

خروشِ نعرۂ پیکار سے خدا کی پناہ
فقیہِ شہر کی گفتار سے خدا کی پناہ

جلالِ منبر و محراب سے حذر واجب
کمالِ جبّہ و دستار سے خدا کی پناہ

طوافِ بادہ و مینا سے درگذر لازم
جمالِ غازۂ رُخسار سے خدا کی پناہ

نوادراتِ چمن پر خزاں کے پہرے ہیں
سیاسیات کی رفتار سے خدا کی پناہ

ادیبِ عصر کے افکار میں خلوص کہاں؟
خطیبِ وقت کی للکار سے خدا کی پناہ

چمن کدوں میں گل و لالہ دل گرفتہ ہیں
ہوائے گیسوئے خمدار سے خدا کی پناہ

خدا کا خوف اُٹھا، شرمِ مُصطفٰے نہ رہی
صنم فروشئ احرار سے خدا کی پناہ

خودکشی سے پہلے

بادِ صرصر کے تھپیڑوں میں سمن بھی دیکھے
آہ اے عمرِ رواں تیرے چلن بھی دیکھے
وقت پڑنے پہ زمانے نے بدل لیں آنکھیں
وائے بر حالِ، عزیزانِ وطن بھی دیکھے
"کون ہوتا ہے حریفِ مئے مرد افگنِ عشق"
ہم نے سو بار رفیقانِ سخن بھی دیکھے
خونِ دل حلقۂ زنجیر کا عنواں ٹھہرا
پسِ دیوارِ قفس دار و رسن بھی دیکھے
ہم نے اس دور کے انصاف کا چہرہ دیکھا
ہم نے اس عہد کے اربابِ وطن بھی دیکھے

خودکشی کے بعد

قید ہم جھیل چکے دار و رسن دیکھ چکے
خوب جی بھر کے زمانے کا چلن دیکھ چکے

موت کا خوف بہ عنوانِ دگر بیت گیا
زندگی کیا ہے؛ عزیزانِ چمن دیکھ چکے

جو نہ دیکھا تھا بہر حال نظر آ ہی گیا،
ترے انداز بھی اے چرخِ کہن دیکھ چکے

ہائے او موت ترا لطفِ عمومی دیکھا
وائے اے زیست ترے رنج و محن دیکھ چکے

شکر ایزد کہ حریفوں کو شکایت نہ رہی
ہم تو بے مہریِ یارانِ وطن دیکھ چکے

واردات

صد شکر کہ یہ شام و سحر میرے لیے ہے
کونین بہ الفاظِ دِگر میرے لیے ہے
شاخوں میں گل و لالہ کھلے ہیں تو مجھی سے
ذرّوں پہ ستاروں کی نظر میرے لیے ہے
ثابت ہے یہ رخشندگیِ ارض و سما سے
تابندگیِ شمس و قمر میرے لیے ہے
دہلی کے رگ و پے میں مرا خونِ جگر ہے
لاہور کے عارض کی سحر میرے لیے ہے
کابل ہے مرے پنجۂ افکار کی زد میں
شیراز بہ عنوانِ دگر میرے لیے ہے
یہ کوہ و دمن میری فراست کا صلہ ہیں
یہ سلسلۂ شام و سحر میرے لیے ہے
پنجاب کے گیتوں کی اُڑانیں ہیں مجھی سے
بنگال کے جادو میں اثر میرے لیے ہے

بہار آئی تو ------

کمالِ دعند غۂ انقلاب دیکھا ہے
ہر اک وزیر کو گردوں رکاب دیکھا ہے
ہزار بار گھنی داڑھیوں کے سائے ہیں
خدا کا خوف بہ عنوانِ خواب دیکھا ہے
بہار آئی تو اس شہرِ لالہ و گل ہیں
جو رہنما تھے اُنھیں بے نقاب دیکھا ہے
سرودِ منبر و محراب کے رگ و پے ہیں
خروشِ نغمۂ چنگ و رباب دیکھا ہے
ذلیل لوگ خدایانِ عصرِ حاضر ہیں
یہ ایک معجزۂ اِنتخاب دیکھا ہے
جو کاسہ لیس کبھی انقلاب دشمن تھے
اِسی چمن میں اُنھیں کامیاب دیکھا ہے
فقیہ و صوفی و مُلّا کو خانقاہوں میں
فغاں کہ تاجرِ اُمُّ الکتاب دیکھا ہے

ہمارے بعد

فضا ہیں رنگ ستاروں میں روشنی نہ رہے
ہمارے بعد یہ ممکن ہے زندگی نہ رہے
خیالِ خاطرِ احباب واہمہ ٹھہرے
اس انجمن میں کہیں رسمِ دوستی نہ رہے
بزنگِ نالۂ دل انقلاب برپا ہو،
بنامِ دار و رسن ذوقِ خود روی نہ رہے
فقیہِ شہر کلامِ خدا کا تاجر ہو
خطیبِ شہر کو قرآں سے آگہی نہ رہے
قبائے صوفی و مُلّا کا نرخ سستا ہو
بلالؓ چُپ ہو اذانوں میں دل کشی نہ رہے

نوادراتِ قلم پر ہو محتسب کی نظر
محیط ہو شبِ تاریک روشنی نہ رہے

وفا نہیں نہ سہی، لذتِ جفا ہی سہی
اِس ایک جنس کی بازار میں کمی نہ رہے

اس انجمن میں عزیزو یہ عین ممکن ہے
ہمارے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہے

حرف و حکایت

کچھ لوگ بوئے گل سے پریشاں ہیں آج کل
ہر چند ان سے کوئی عداوت نہیں مجھے
افسانۂ حیات رقم کر رہا ہُوں میں
ہرگز کسی سے کوئی شکایت نہیں مجھے
کہتا ہوں صاف صاف عزیزانِ محترم
جو لکھ چُکا ہوں اس پہ ندامت نہیں مجھے
میں اور دوستوں کی عنایت سے انحراف؟
"یہ تاب، یہ مجال، یہ طاقت نہیں مجھے"

یہ نظم ان دنوں لکھی گئی جب میں "بوئے گل، نالۂ دل، دودِ چراغِ محفل" کے زیرِ عنوان اپنی سرگزشت لکھ رہا تھا اور میرے قلم کی بوقلموں گستاخیوں سے بعض "خانہ برانداز چمن" برافروختہ تھے۔

میرے لیے قلم کا سکوں ہے عزیز تر
اب آرزوئے ذوقِ خطابت نہیں مجھے
"منظور ہے گزارشِ احوالِ واقعی!
اپنا بیان حُسنِ طبیعت نہیں مجھے
رُوئے سخن کسی کی طرف ہو تو رُوسیاہ
سودا نہیں، جنوں نہیں، وحشت نہیں مجھے"
ہر رہنما کو دیکھ چکا ہوں قریب سے
"کہتا ہوں سچ کہ جھوٹ کی عادت نہیں مجھے"

اس انجمنِ گُل میں شعلے بھی تھے شبنم بھی

پس منظر ۱۸۵۷ء

دار پر اب جانشینِ بابر و تیمور ہیں
تاج کے وارث گدائی کے لیے مجبور ہیں
جعفرانِ دین و دانش ہیں حرم کے پاسباں
سینۂ ملّت میں یہ رستے ہوئے ناسور ہیں

پیش منظر ۱۸۵۷ء

وارثِ تختِ رسالت دار پر کھینچے گئے
مسجد و محراب و منبر کی زبانیں کٹ گئیں
کوچہ و بازار میں خاکِ حرم اڑنے لگی
بُوذرؓ و سلمانؓ و طارقؒ کی سنانیں کٹ گئیں

غالبؒ

خاکِ دہلی میں بہت سے لولوئے لالا بھی تھے
ان میں غالب ہم مقامِ حافظ و خیّام تھا
شہپرِ جبریل کا سایہ تھا اس کی فکر پر
اس کی مینائے غزل میں بادۂ الہام تھا

محمد قاسم نانوتوی

دین و دانش کا مرقع آدمی کے روپ میں،
اس طرح اُٹھا حرم کی پاسبانی کے لیے
جیسے آغازِ سحر میں طائرانِ خوش نوا
چہچہاتے ہیں صبا کی ہمزبانی کے لیے

سرسید

ایک رہبر ماضیٔ مرحوم سے دامن کشاں
یوں نظر آتا ہے جیسے خندۂ شمشیر ہے
یا کسی پُر ہول سناٹے کی سنگینی کے ساتھ
دامنِ عزم تاب پر خورشید کی تنویر ہے

محمود الحسن

ہم زباں کوئی نہیں اور ہم سخن کوئی نہیں
رات گہری ہے چراغِ انجمن کوئی نہیں
دعوت و ارشاد کی تجدید کے داعی تو ہیں،
وائے ناکامی کہ محمود الحسن کوئی نہیں

شبلیؒ

کاسۂ شب سے مئے کہنہ زمیں پر بہ گئی
آفتاب اُبھرا تو غنچے پھول ہو کر رہ گئے
اک ثنا خوانِ نبیؐ کی داستان ہائے نشاط
میکدے میں خوشہ چینانِ عطیّہ کہہ گئے

حالیؒ

دہلیِ مرحوم کے اس دَورِ پُر آشوب میں
کچھ ادیب العصر بھی کچھ شاعرِ عالی بھی تھے
لیکن ان الجھی ہُوئی راہوں میں با حالِ تباہ
ہم زبانِ سیّدِ خستہ جگر، حالی بھی تھے

محمّد علی جوہرؒ

حادثے اٹھے فضا کانپی، فلک چکرا گیا
کوہساروں کی جبینوں پر پسینہ آگیا
رہنما ایسا کہ مالا بار سے لاہور تک
ہر جگہ پیر و جواں کے قلب کو گرما گیا

اقبالؔ

حافظ و خیّام کی پرواز لے کر آگیا
ایک شاعر میرؔ و غالبؔ کی ہمہ دانی کے بعد
نغمۂ یثرب کی خاطر ساز لے کر آگیا
ایک دیوانہ جمال الدّین افغانی کے بعد

ظفر علی خاں

ایک میرِ قافلہ یہ بھی تھا ہم احرار میں،
لیکن اب پیرانہ سالی کے سبب کچھ بھی نہیں
ایک ہنگامہ کہ خیبر پار سے بنگال تک
ماضیِ مرحوم میں سب کچھ تھا اب کچھ بھی نہیں

بُوئے گُل، نالۂ دِل، دُودِ چراغِ محفل

دل ہی تو ہے

دل گذرگاہِ ماہ و انجم ہے
پھر بھی ظلمت ہے اور نہیں چھٹتی
جیسے اک ماہ رُو کے پہلو میں
رات کٹتی ہے پر نہیں کٹتی

کھنک

گیت جب چھیڑتی ہیں ہٹیاریاں
نکہتِ زُلف پھیل جاتی ہے
آنچلوں کی صدائیں آتی ہیں
چوڑیوں کی کھنک ستاتی ہے

مالنیں

مالنیں گُنجِ گلستاں سے چلی آتی ہیں
پھول ہی پھول اٹھائے ہوئے لہرائے ہوئے
جیسے دھرتی پہ مہ و مہر اُتر آئے ہوں
رات کے خواب کی تعبیر سے شرمائے ہوئے

نقرئی قہقہے

میکدے کو اُجال دیتی ہیں ،
نُقرئی قہقہوں کی تصویریں
جیسے اک نازنیں کے عارض پر
رات کی ناتمام تحریریں

رامش و رنگ

رامش و رنگ کے جزیرے میں
نوجوانی شراب کی رَو ہے
مطربہ کی نوائے شعلہ گداز
بتکدے کے چراغ کی لَو ہے

بروگن

اک بروگن کی خشک پلکوں سے
شمع بے نور مسکراتی ہے
جیسے انجان شاہراہوں پہ
چاندنی رات جھلملاتی ہے

شبنمی گیت

بادلوں کے حسین آنچل میں
آتشیں راگ مسکراتے ہیں
جیسے پھولوں کے نرم گالوں میں
شبنمی گیت لہر کھاتے ہیں

مٹیار

اتنی معصوم ایک دوشیزہ؟
آنسوؤں کی پھوار بہتی ہے
جیسے دھیمے سُروں میں رقاصہ
قصّۂ روزگار کہتی ہے

روشنی

نازنینوں کے بدن رات کی تنہائی میں
اہلِ دولت کی شبِ تار کو لَو دیتے ہیں
جیسے لب ہائے عقیقی کی ہنسی کے فانوس
وقت کے چہرۂ تاریک کو ضَو دیتے ہیں

طلوعِ شعر

اُفقِ ذہن پہ احساس کی ہلکی سی لکیر،
چاندنی رات کے پہلو سے کرن پھوٹی ہے
عرقِ رُخ سے کوئی قطرۂ مے ٹپکا ہے
نقرئی لب پہ کسی گیت کی لے ٹوٹی ہے

فقیہِ شہر

آپ ہیں دعوت و ارشاد کی مسند کے امیں
آپ نے نامِ رسالت پہ کمائی کی ہے
آپ نے چادرِ زہرا کا سہارا لے کر
ابوسفیان کے پوتے کی گدائی کی ہے

قبریں

موت کی دردناک تحریریں
خاک کی گود میں نہفتہ ہیں
مرقدوں کے خموش پہلو میں
شعلہ ہائے حیات خفتہ ہیں

وداع

چاندنی رات جب بچھڑتی ہے
اک سیہ داغ چھوڑ جاتی ہے
جیسے اک نائکہ کی تنہائی
اپنے ماضی پہ تلملاتی ہے

اُداس چھاؤں

عشق کے ساز ٹوٹے جاتے تھے
اک عجب خامشی ہے گاؤں میں
جیسے سُورج کی غم زدہ کرنیں
مرقدوں کی اُداس چھاؤں میں

سبز کھیت

دُور گاؤں کے سبز کھیتوں میں
لڑکیاں زاویے سے بُنتی ہیں
جھانجنوں سے فضا سُلگتی ہے
ٹہنیوں سے کپاس چُنتی ہیں

آنچل

آنچلوں کی حسیں اڑانوں میں
اُن کے گیت سرسراتے ہیں
جیسے آکاش کے ستاروں میں
رات بھر پھول مسکراتے ہیں

سفینہ

ریشمی رنگ کے ڈوپٹے پر
نقرئی تار جگمگاتے ہیں
جیسے مہتاب کے سفینے میں
پھول ہی پھول مسکراتے ہیں

ڈھولک

تالیوں کی تال سے ڈھولک کے نغمے تیز ہیں
احمریں ہونٹوں کی آوازیں طرب انگیز ہیں
دخترانِ شعر و نغمہ کون سمجھائے تمہیں
تم جنہیں محبوب سمجھی ہو، وہ سب چنگیز ہیں

قہقہہ

بادہ خواروں کے قہقہوں کا خروش
جیسے اک مغویہ کی برنائی
یا کسی بوالہوس کے پہلو میں
اک طوائف بوقتِ تنہائی

راوی کا سفر

اک چھریرا نوجواں بارہ دری کی اوٹ میں
اپنی محبوبہ سے دل کی داستاں کہتا رہا
دن ڈھلے تک عشق کی سب منزلیں طے ہو گئیں
اور راوی بے بصر راوی یونہی بہتا رہا

کہانی

ایک دوشیزہ درختوں کی گھنیری چھاؤں میں
اس طرح نکلی محبت کا نتیجہ چھوڑ کر
جس طرح دیہات کے پٹے سنہری کونپلیں
پھینک آتے ہیں شگفتہ ٹہنیوں کو توڑ کر
اور — گلابی شاخساروں کی کلائی موڑ کر

○

کرامات

پیر جی حجرے سے نکلے ہیں عصا تھامے ہوئے
اک عقیدت کیش کی زلفِ رسا سے کھیل کر
اک مریدِ خاص کی عزت سے ہو کر دو بدو
اک اچھوتی نوجوانی کی حیا سے کھیل کر
اور — تنہائی میں تسلیم و رضا سے کھیل کر

○

خرید و فروخت

رات اس بازار میں اک حور وش کی سیج پر
اک فقیہِ شہر کی ریشِ حنائی بک گئی
دھن دھنا دھن کی صدا میں کھو گیا احساسِ زہد
منبر و محراب کی شعلہ نوائی بک گئی
بک گئی بکنے کی شے تھی پارسائی بک گئی

دلچسپ تضاد

ایک دھجی تک نہیں زہرا کے عُریاں جسم پر — باپ نے سوچا تو اس احساس سے گھبرا گیا
بے محابا نالہ ہائے دل لبوں تک آ گئے — ایکا ایکی خشک آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا
مہر و مہ کانپے، زمیں لرزی، فلک تھرّا گیا

○

نیلامِ عصمت

بیچ ڈالی باپ نے بیٹی کی عصمت قرض میں — خان زادے فصل سے پہلے بٹائی لے گئے
دھان کی فصلوں پہ ساہو کار نے قبضہ کیا — سیٹھ صاحب کے ملازم پائی پائی لے گئے
ایک خستہ حال دہقاں کی کمائی لے گئے

○

ریشم میں ٹاٹ کا پیوند

بسترِ سنجاب پر چودہ برس کی بیسوا — اک بہتّر سال کے بڈھے سے ہم آغوش ہے
کہکشانی جسم بکتے ہیں بھرے بازار میں — بالاخانوں کی بلندی معصیت بر دوش ہے
اور ــــ اس طُرفہ تماشے پر خدا خاموش ہے

لہو کی چاٹ

کس مزے سے ڈوم کی بیٹی سے ہم آغوش تھا گاؤں کے اک خان کا بیٹا پرانی کھاٹ پر
دن چڑھا تو اُس کے بستر کا غبارِ نیم شب نوکرانی لے گئی دھونے کو دھوبی گھاٹ پر
گنگ ہے فطرت غریبوں کے لہو کی چاٹ پر

○

مغویہ عصمت

کون ہے، اک مغویہ عصمت ہے باحالِ زبُوں دو برس اغیار کے "نرغے" میں رہ کر آئی ہے
اک حزیں نغمہ ہے عفّت کے شکستہ ساز پر ایک کونپل صرصرِ حالات سے مرجھائی ہے
اور — اپنی گود میں اک ارمغاں بھی لائی ہے

○

سانحہ

ذہن پر اک فکر چھایا، خوف سا طاری ہوا گاؤں میں بدبخت ہرنوں کے شکاری آگئے
سر کٹے، تیغیں اُٹھیں، بھالے چلے، گھوڑے بڑھے سبز کھیتوں پر سیاہی کے علم لہرا گئے
شہریوں کی ذہنیت کا آئینہ جھلکا گئے

تانگے والا

رات سے لے کر سحر تک نو گزرے کے چوک میں
تانگے والا سوچتا ہے اپنے اس مقسوم پر
جانے کب فارغ ہوں ان کوٹھوں سے اربابِ نشاط
لالہ رُخ، زہرہ جبینوں کے بدن سے کھیل کر
اک اٹھنّی کی اُمید اور سختیٔ شام و سحر

○

جبرِ مسلسل

فٹ پاتھ پہ بے گور و کفن لاش پڑی ہے
رہگیر کی میّت کو مشیّت سے گلہ ہے
گمراہ زمانہ کی روش سے ہے شکایت
بے درد خداؤں کی حمیّت سے گِلہ ہے
اک جبرِ مسلسل کی اذیّت سے گلہ ہے

○

داتا کی نگری

بھنگ پی کر مست ہیں داتا کی نگری کے فقیر
نشّے کی لَو سے ہمکتی ہے 'انا الحق' کی صدا
اک برو گن گا رہی ہے بر سرِ تعویذ سنگ
گنج بخشِ فیضِ عالم مظہرِ نُورِ خدا
ناقصاں را پیرِ کامل، کاملاں را رہنُما

ہونہار بروا

زاہدہ کہتی تھی امّی سے ترانہ دیکھ کر   میری امّی ! جی میں آتا ہے مدھوبالا بنوں
زاویے بنتی ہوئی نکلوں فضائے رقص میں   اس چمن میں پھول کھلاؤں گلِ لالہ بنوں
اور — اُفق پر چودھویں کے چاند کا ہالہ بنوں

○

ارتقا، تہذیب

آج کل تہذیب کے اس ارتقائی دور میں   دینِ فطرت سے بغاوت کے تقاضے عام ہیں
دعوتِ دامِ ہوس ہے گیسوؤں کا پیچ و خم   ریشمی سیلنوں کی مخروطی چٹانیں جسام ہیں
مہ جبینوں کے لبِ لعلیں پہ بھی الزام ہیں

○

انسان اور کُتّا

دُم بریدہ سگ ہیں ایوانِ شہی میں باریاب   بے نواؤں کے لیے جود و سخا نابود ہے
پالتو کتے ہیں حورانِ حرم کے ہم نشیں   خوانِ نعمت پر شرابِ احمریں موجود ہے
حاکمانِ شہر سے خوفِ خدا مفقود ہے

گُم شُدہ الفاظ

قرآں کا جگر چاک ہے منبر کی صدا سے
مُلّا کی نوا پر کسی نوحے کا گماں ہے
ہیں پیرہنِ زہد ہیں دُزدانِ مے و جام
ہر موڑ پہ سوداگریٔ گُلبدناں ہے
آواز دو انصاف کو انصاف کہاں ہے

○

خرقۂ سالوس

ثابت یہ ہوا رسم و رہِ خانقہی سے
ہر خرقۂ سالوس میں اک تازہ خدا ہے
حُوروں کے تصوّر میں لٹیں بکھری ہُوئی ہیں
عصمت کا لہو بسترِ قاقم پہ رواہے
پیرانِ حرم بے یدِ بیضا ہیں تو کیا ہے

○

ذاکر

لختِ دلِ زہراؑ کے عزادار ہیں یکجا
ہر پیر و جواں ماتمیٔ کرب و بلا ہے
اک تاجرِ الفاظ بہ عنوانِ شہادت
تقدیسِ حسینؑ ابنِ علیؑ بیچ رہا ہے
ذاکر کی عبا، زینب و صُغراؑ کی ردا ہے

میزانِ خطابت

اک ذاکرِ خوش چہرہ سرِ منبر و محراب
شبیرؑ کی مدحت کے علم کھول رہا ہے
شیون کے تاثّر سے ہیں الفاظ گلوگیر
بولا نہیں جاتا ہے، مگر بول رہا ہے
میزانِ خطابت میں لہُو تول رہا ہے

○

ھٰذا مِن فضلِ ربّی!

منبر و محراب کی تاریکیوں کے ہم رکاب
معصیت پروان چڑھتی ہے خدا کے نام پر
خانقاہوں میں مریدانِ صفا کی ابلہی!
ایک دھبّہ ہے فقیہانِ غلط انجام پر
حیف ان اربابِ عزّ و جاہ کے اسلام پر

○

نوٹ اور چوٹ

مال پر ہوٹل سے نکلی ایک تصویرِ شباب
کون ہے عورت ہے لیکن معصیت کی پوٹ ہے
لڑکھڑاتی چال میں تلخابۂ شب کا خروش
عصمتِ ملفوف پر اہلِ ہوس کی چوٹ ہے
اور حنائی ہاتھ کی مُٹھی میں شاید نوٹ ہے

مُلکِ خُدا

خان زادوں کے تصرّف میں ہے فرِ سلطنت
کاسہ لیسوں کے سروں پر سایۂ افرنگ ہے
خونِ محنت سے فروزاں ہے چراغِ اقتدار
سیم و زر اور آدمیت میں پُرانی جنگ ہے
بے نواؤں کے لیے مُلکِ خدا بھی تنگ ہے

○

مرے لیے

ہیں یاسمین و سُنبل و ریحاں مرے لیے
جلوے چمن چمن ہیں فراواں مرے لیے

اُٹھوں تو آسماں کی بلندی ہے ہم رکاب
بیٹھوں تو فرشِ مہرِ درخشاں مرے لیے

بولوں تو غنچہ ہائے چمن گُنگنا اٹھیں
چُپ ہوں تو چاندنی ہو غزلخواں مرے لیے

پڑھنے لگوں تو ارض و سما کے ورق کھُلیں
لکھّوں تو صفحہ ہائے گلستاں مرے لیے

بڑھنے لگوں تو گردشِ دوراں ہو ہم قدم
ٹھہروں تو ذرّہ ذرّہ ہو رقصاں مرے لیے

دامانِ باغباں سے کفِ گُل فروش تک
بکھرے پڑے ہیں سینکڑوں عنواں مرے لیے

سید انور حسین زیدی نفیس رقم لاہور